طلوعِ اسلام

جنوری ۱۹۵۱

Next issue :—

BASIC PRINCIPLES OF CONSTITUTION IN THE LIGHT OF THE QURAN

★

-/8/-

اسلامی حیاتِ اجتماعیہ کا ماہوار مجلّہ

طلوعِ اسلام

کراچی

قیمت فی پرچہ	مُرتّب	بدلِ اشتراک
آٹھ آنے (پاکستانی)	محمد یونس	سالانہ: چھ روپے پاکستانی (نو روپے ہندوستانی)
بارہ آنے (ہندوستانی)		غیر ممالک سے ۱۲ شلنگ

جلد ۴	جنوری سنہ ۱۹۵۱ء	نمبر ۱

فہرست مضامین

لمعات	۲ - ۱۵
مثلہٗ معہٗ	۱۷ - ۴۶
علامہ اسلم جیراجپوری کا مکتوب	۴۷-۴۸
حافظ محب الحق صاحب مرحوم	۴۹-۶۰
دستورِ پاکستان	۶۱-۶۸
باب المراسلات	۶۹-۷۵
دستورِ پاکستان سے متعلق سفارشات	۷۶-۷۷

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

الحمد للہ الذی ارسل رسولہ بالھدیٰ ودین الحق لیظھرہٗ علی الدین کلہٖ وکفیٰ باللہ حسیباً۔

طلوعِ اسلام کے دورِ ثانی کی زندگی کے تین سال ختم ہو گئے اور اشاعتِ رواں سے یہ اپنی عمر کے چوتھے سال میں قدم رکھتا ہے۔ ہم جب اس کی قطع کردہ مسافت پر نگہِ بازگشت ڈالتے ہیں تو خود حیران رہ جاتے ہیں کہ اس بے سروسامانی کے باوجود اس نے اس قدر دشوار گذار راستے کس طرح سے طے کر لئے۔ یقیناً یہ اللہ کی توفیق کے بغیر کسی طور بھی ممکن نہ تھا۔ اللہ کی توفیق اس لئے کہ اس نے اپنے امکان بھر کوشش کی کہ اس کا ہر قدم آئینِ خداوندی کے ساتھ ہم آہنگی سے اٹھے۔ اسی تطابق و توافق سے اللہ کی تائید و توفیق نصیب ہو سکتی ہے۔ اس کی اس سعی و کاوش کے نتیجہ میں اگر کوئی کام کی چیز مرتب ہو سکی ہے تو وہ قانونِ خداوندی سے اس ہم آہنگی اور توافق کا نتیجہ ہے اور اگر اس میں کچھ کوتاہیاں سرزد ہوئی ہیں تو اس کی ذمہ دار اس کی اپنی کم ہمتی اور کوتاہ دامنی ہے۔ یوں تو صدرِ اوّل کے بعد وہ کونسا دور ہے جو قرآنی آواز کے لئے ناساعد نہیں رہا لیکن ہمارے دور کی ناموافقت نمایاں حیثیت لئے ہوئے ہے۔ اس دور میں قرآنی آواز کو داخلی اور خارجی دونوں محاذوں کا مقابلہ کرنا پڑتا ہے۔ داخلی محاذ وہی ہے جو وراثتی مذہب اور روایتی روش کا علمبردار ہے۔ یہ طبقہ اس مسلک کا داعی اور نقیب ہے جو ہمارے اس دور میں پیدا ہوا جس میں پوری کوششوں اور ہر قسم کی سازشوں سے مسلمانوں کی عملی زندگی سے قرآن کو الگ کر دیا گیا اور اسلام نام رکھ لیا گیا ان تصورات، معتقدات اور رسومات کا جو عیسائیوں کی خانقاہوں، یہودیوں کے صومعوں اور ایرانیوں کے آتشکدوں سے رنگتی ہوئی حریمِ کعبہ میں داخل ہو گئیں، اور جنہیں ملوکیت کی مفاد پرستیوں نے اپنے سایۂ عاطفت میں پروان چڑھایا۔ البتہ ان کے ساتھ قرآن کا نام اس طرح چسپاں رکھا جس طرح عباسی سلاطین اپنی تاجپوشی کے وقت حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ردائے مبارک اوڑھ لیا کرتے تھے۔ اس اسلام نے ملوکیت اور پیشوائیت کے بتوں کے ان ٹکڑوں کو ایک ایک کر کے اپنی خرگانِ عقیدت سے چنا جنہیں حاملِ قرآن صلی اللہ علیہ وسلم کی ضربِ کلیمی نے پاش پاش کر دیا تھا اور ارباب من دون اللہ کے ان قہرمانی مجسموں کو اپنی خود ساختہ روحانیت کے بپتسموں سے متبرک و مقدس بنا کر مسلمانوں کے قلب و دماغ پر اس طرح مسلط کر دیا کہ وہاں پھر نہ خدا باقی رہا نہ اس کا بھیجا ہوا قانون، نہ انسانیت باقی رہی نہ اس کا شرف و احترام۔ اب اس طبقے کی حالت یہ ہے کہ ان کے نزدیک یہودیت کے افسانے، عجمیت کی داستانیں، عیسائی رہبانیت کی روحانیت، اور ہمارے دورِ انحطاط کی پیدا کردہ رسمیت سب قابلِ قبول ہیں لیکن اگر قابلِ قبول نہیں تو قرآن کی پیش کردہ

تعلیم نہیں، چونکہ قرآن کو ایک نہایت گہری سازش کے ماتحت مسلمانوں کی زندگی سے دور ہٹا دیا گیا تھا۔ اس لئے اس سازش کی غیر شعوری وراثت کا نتیجہ یہ ہے کہ قرآن کے نام سے ان کے بدن میں آگ لگ جاتی ہے اور ان کا جی چاہتا ہے کہ جس حلق سے یہ آواز نکلی ہے اسے فوراً حوالۂ دار و رسن کر دیا جائے۔

دوسری طرف خارجی محاذ کو لیجئے۔ عیسائیت کی غیر فطری تعلیم کے ستائے ہوئے یورپ نے ردعمل اختیار کیا تو انسان کو حیوان کی سطح پر لاکر کھڑا کر دیا۔ اس کے نزدیک انسان ایک پیکرِ آب و گل سے زیادہ کچھ نہ رہا۔ اس نظریہ کی تکمیل روس میں جاکر ہوئی جہاں مارکس کے فلسفہ نے انسان کی زندگی کے تمام مسائل کو روٹی کے اندر مرکوز کر کے رکھ دیا۔ جب انسان کی نگہ بصیرت فکر انسانی کے اس تسفل کو دیکھتی ہے تو گردابِ حیرت بن جاتی ہے کہ کہاں اس کا یہ عالم کہ ـــ دردشتِ جنونِ من جبریل زبوں صیدے ـ اور کہاں اس کی یہ کیفیت کہ ٹانگے کے گھوڑے کی طرح چارہ مل جانے ہی میں تکمیلِ حیات مقصود۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ انسان کیلئے روٹی کا مسئلہ کچھ کم اہمیت نہیں رکھتا۔ اس کی طبعی زندگی روٹی ہی کے سہارے قائم رہتی ہے، چونکہ دنیا کے غلط نظام نے انسانوں کی ایک کثیر آبادی کو روٹی سے محروم کر رکھا ہے اس لئے یہ انسان روٹی کی آواز پر لبیک کہنے پر مجبور ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ تحریک ایک سیلاب کی طرح ہر طرف بڑھتی چلی جا رہی ہے۔ جس مذہب کو ہمارا مولوی پیش کرتا ہے وہ اس سیلاب کو روکنے کی کوئی قوت اپنے اندر نہیں رکھتا۔ وہ مذہب اس قسم کا ہے جس قسم کی یورپ کی عیسائیت تھی۔ عیسائیت اس تحریک کو نہیں روک سکی، اسی طرح ملا کا مذہب بھی اسے نہیں روک سکے گا۔ اسے اگر دنیا میں کوئی قوت روک سکتی ہے تو وہ صرف قرآن کی قوت ہے۔ جس نے روٹی کے مسئلہ کو "دنیا داری" کے حوالے کر کے اپنی توجہ "روحانیت" پر مرکوز نہیں رکھی بلکہ اس نے سب سے پہلے روٹی کے مسئلہ کا حل پیش کیا اور جب انسان پیٹ بھرنے کے بعد اطمینان سے بیٹھا تو پھر اسے بتایا کہ روٹی ایک بلند نصب العین حاصل کرنے کا ذریعہ ہے، مقصود بالذات نہیں۔ قرآنی انقلاب کے منشور کا پہلا فقرہ رب العالمین (ربوبیت عامہ) کی تحریک کا نقیب ہے اور اس کا آخری رب الناس کے تصور کی تکمیل۔ ربوبیت عامہ کا یہی قرآنی تصور ہے جسے عام کرنے کی سعادت طلوعِ اسلام کے حصہ میں آئی ہے اور وہ اس سعادت پر جس قدر فخر کرے کم ہے۔ اس لئے کہ یہی تحریک روسی مادیت کے اس بڑھتے ہوئے سیلاب کو روک سکے گی جو انسان کو حیوان کی سطح پر لاکر چھوڑ دیتی ہے اور دوسری طرف یہی تحریک ملا کے اس مذہب کو ختم کر دیگی جو روسی تحریک کو بالواسطہ ہوا دینے کا موجب بن رہا ہے۔ طلوعِ اسلام سے نہ ملا راضی رہ سکتا ہے نہ روسی ملحد۔ قرآن اپنے اصولوں کو چھوڑ کر کسی ازم اور کسی ہیئت کے ساتھ مفاہمت نہیں کر سکتا خواہ اس کے ساتھ غلط تقدس کا لیبل لگ رہا ہو یا مفادِ عاجلہ کی جاذبیت وجہ کشش بن رہی ہو۔

طلوعِ اسلام کے دورِ اول کی ابتدا اس زمانہ (۱۹۳۸ء) میں ہوئی جب ہندوستان کے مسلمان کی اجتماعی زندگی بیم و رجا کے دوراہے پر کھڑی تھی اور اس کا مستقبل زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا تھا۔ ہندو اکثریت ان مسلمانوں پر حکومت کے منصوبے باندھ رہی تھی جنھوں نے

ایک ہزار سال تک ان پر حکومت کی تھی۔ انگریز کی مفاد پرستی ہندو کا ساتھ دے رہی تھی۔ اس وقت خدا کا ایک نحیف و زار بندہ اپنے عزمِ آہنی کے ساتھ ملتِ اسلامیہ کی وکالت کے لئے اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ انگریز اور ہندو دونوں کی متحدہ مخالفت کا مقابلہ کر سکتا تھا۔ لیکن وہاں ایک تیسری قوت تھی جس کا مقابلہ اس کے لئے کچھ مشکل نظر آتا تھا۔ یہ تھا ان "علمائے کرام" کا طبقہ جو اپنے آپ کو نیشنلسٹ کہلاتا تھا۔ مسلمان مذہب کے راستے بہت جلد بہکایا جا سکتا ہے۔ قال اللہ و قال الرسول کے مقدس نقرے اٹھتے بیٹھتے ان علماء کے ورد زبان رہتے تھے۔ یہ گروہ جو نیزوں پر قرآن لٹکا کر سامنے آرہا تھا بڑا خطرناک تھا۔ اس گروہ کے تیروں کی مدافعت کی خدمت طلوعِ اسلام کے حصہ میں آئی اور جاننے والے جانتے ہیں کہ اس نے اس خدمت کو کس جاں فروشی اور تندہی سے سرانجام دیا۔ اس حقیقت کو آج بطور تحدیثِ نعمت دہرایا جا رہا ہے نہ کسی اور مقصد کے پیشِ نظر۔ طلوعِ اسلام کے سامنے پہلے دن سے ایک ہی مقصد رہا اور وہ یہ کہ خدا کی اس وسیع و عریض زمین پر کوئی گوشہ تو ایسا ہو جہاں اس کے قانون کے مطابق زندگی بسر کرنے کا امکان ہو۔ تحریکِ پاکستان ایک ایسے خطۂ زمین کے حصول کی کوشش تھی جہاں طلوعِ اسلام کو اپنا یہ مقصد پورا ہوتا دکھائی دیتا تھا۔ طلوعِ اسلام کی تحریکِ پاکستان کے ساتھ والہانہ شیفتگی محض اس وجہ سے تھی ورنہ نہ اس نے کبھی مسلم لیگ سے کچھ لیا، نہ اربابِ حل و عقد سے کچھ مانگا۔ وہ اس تحریک کی کامیابی میں اپنی آرزوؤں کی تکمیل اور اپنے سودائے عشق کی تسکین کا سامان دیکھتا تھا۔ اس لئے اس کے سامنے کوئی اور مقصد وجہ کشش ہو ہی نہیں سکتا تھا۔

طلوعِ اسلام نیشنلسٹ علماء کے حملوں کی مدافعت کی طرف سے ہنوز پورے طور پر مطمئن نہیں ہوا تھا کہ اسے ایک اور سمت سے خطرے کے نشانات دکھائی دیئے۔ اس وقت مسلمانوں کی کامیابی کا راز فقط اس نکتے میں پوشیدہ تھا کہ وہ سب کے سب ایک مرکز سے وابستہ ہو جائیں تاکہ اس مرکز سے پیش کردہ مطالبہ پاکستان تمام ملتِ اسلامیہ کا متفقہ مطالبہ سمجھا جا سکے۔ وہ وقت ایسا نازک تھا کہ اگر مسلمانوں کی اس ملی مرکزیت میں ذرا سی جنبش بھی ہو جاتی جس سے یہ مترشح ہو جاتا کہ پاکستان کا مطالبہ کم از کم اکثریت کا مطالبہ نہیں ہے تو (نصیب اعداء) پاکستان کا تصور اس سے خوابِ پریشاں بن کے رہ جاتا۔ وہ خطرہ جس کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا ہے ابوالاعلیٰ مودودی صاحب کی وہ کوششیں تھیں جن کی رو سے انہوں نے پاکستان کے مطالبہ کو غیر اسلامی مطالبہ اور مسلمانوں کی اس اجتماعی مرکزیت کو جو اس مطالبہ کی دلیل تھی "غیر اسلامی اجتماعیت" سے تعبیر کرنا شروع کر دیا۔ مودودی صاحب اس سے پہلے متحدہ قومیت کے نظریہ کے خلاف بہت کچھ لکھ کر مسلمانوں میں مقبولیت حاصل کر چکے تھے اور علامہ اقبالؒ کی نگہ شفقت کی بدولت دارالاسلام (پٹھانکوٹ) میں پہنچ کر کچھ شہرت بھی حاصل کر چکے تھے۔ اس لئے ان کی طرف سے یہ تحریک جو "خالص اسلامیت" کے نقاب میں آگے بڑھائی جا رہی تھی نیشنلسٹ علماء کی کوششوں سے زیادہ خطرناک تھی۔ طلوعِ اسلام نے مسلمانوں کو اس خطرہ سے بھی متنبہ کیا۔

بہرحال ان تمام مخالفتوں کے علی الرغم پاکستان وجود میں آگیا۔ وذالک الفوز العظیم۔

جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے طلوع اسلام کے پیش نظر مقصد وحید یہ تھا کہ ایسا خطۂ زمین مل جائے جس میں قرآنی نظام کا عملی نفاذ ہو سکے۔ اسے اس امر کا بخوبی اندازہ تھا کہ جس چیز کو ہمارا مذہب پرست طبقہ "شرعی نظام" کہہ کر پکارتا ہے اس میں اور قرآنی نظام میں کس قدر فرق ہے۔ لیکن چونکہ مسلمانوں کی نگاہوں سے قرآن عرصہ سے اوجھل ہو چکا تھا اس لئے وہ ان دونوں میں کوئی فرق نہیں کر سکتے تھے۔ اس آنیوالے وقت کی ضرورت کے پیش نظر طلوع اسلام نے اسی زمانہ سے یہ کوشش شروع کر دی کہ مسلمانوں کو بتایا کہ اسلامی نظام میں قرآن، حدیث، فقہ، اور عصری اجتہاد کی پوزیشن کیا ہے۔ مذہب پرست طبقہ نے اس ضمن میں بھی طلوع اسلام کو مطعون کرنے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا۔ لیکن بحمداللہ طلوع اسلام کی یہ آواز رفتہ رفتہ بتدریج اپنا اثر کرتی چلی گئی۔

تشکیل پاکستان کے بعد طلوع اسلام نے پہلی آواز یہ اٹھائی کہ اب مسلم لیگ کی ضرورت باقی نہیں رہی۔ اس آواز پر عام طور پر حیرت ہوئی کہ وہ طلوع اسلام جو مسلم لیگ کی طرف نگاہ اٹھا کر دیکھنے والوں کی آنکھ نکال لینے کے درپے ہو جایا کرتا تھا اب مسلم لیگ کو ختم کرنے کی تجویز کیوں پیش کر رہا ہے۔ لیکن طلوع اسلام کے پاس اس کیلئے بھی قرآنی دلائل تھے۔ ہندوستان میں مسلم لیگ کی ضرورت اس لئے تھی کہ ہمیں انگریز اور ہندو کے سامنے ایک متحدہ مطالبہ پیش کرنا تھا۔ اگر اس مطالبے کی مخالفت خود مسلمانوں کے بعض گروہوں کی طرف سے نہ ہوتی تو ہمیں وہاں بھی کسی الگ جماعت کی ضرورت نہ پڑتی۔ اس صورت میں پاکستان کا مطالبہ ملت اسلامیہ ہندیہ کی طرف سے پیش کیا جاتا۔ لیکن وہاں مسلمانوں ہی کی بعض جماعتوں کی طرف سے اس مطالبہ کی مخالفت ہوئی اور اس لئے وہاں یہ بتانا پڑا کہ مسلمانوں کی اکثریت اس مطالبہ کے حق میں ہے اور اس اکثریت کی ترجمان مسلم لیگ ہے۔ پاکستان کی تشکیل کے بعد اس باب میں دو آوازوں کا سوال ہی ختم ہو گیا۔ اب پاکستان کا ہر مسلمان پاکستانی ہے اور اگر یہاں کوئی مسلمان ایسا ہے جو اب بھی پاکستان کے خلاف ہے یا پاکستان کو ضعف پہنچانے کے درپے ہے تو اس کے مقابلے میں کسی جماعت سازی کی ضرورت نہیں، اس کا مقام پھانسی کا تختہ ہے جس پر ہمیں قدرت حاصل ہے۔ لہٰذا پاکستان میں تحفظ پاکستان کے لئے ایک الگ جماعت ایک ایسا تصور ہے جس کا مفہوم ہماری سمجھ میں نہیں آتا۔ یہاں پوری کی پوری ملت اسلامیہ ایک جماعت ہے جس کا فریضہ تحفظ پاکستان ہے تاکہ اس میں قرآنی نظام قائم ہو سکے۔ ان حالات میں یہاں ملت کے اندر کسی الگ جماعت کا وجود ہمارے نزدیک ملت میں تشتت اور انتشار پیدا کرنے کا موجب تھا۔ اس لئے ہم نے یہ تجویز پیش کی تھی کہ پاکستان میں کسی پارٹی کی ضرورت نہیں۔ لیکن ہماری اس تجویز کو درخور اعتنا نہ سمجھا گیا جس کا نتیجہ یہ ہے کہ اب پوری ملت متعدد ٹکڑوں میں بٹ گئی ہے اور ابھی مزید ٹکڑوں کا امکان ہر وقت باقی ہے۔ ملک میں متعدد پارٹیاں پیدا ہو چکی ہیں اور ہر پارٹی دوسری پارٹی کے خون کی پیاسی ہے۔

چنانچہ ارباب لیگ طلوع اسلام سے اسلئے ناراض ہیں کہ اس نے ایسی تجویز کیوں پیش کی اور دوسری پارٹیوں والے اس لئے کبیدہ خاطر کہ طلوع اسلام کسی پارٹی کو بھی حق پر نہیں سمجھتا۔

تشکیل پاکستان کے بعد ہماری اپنی حکومت وجود میں آگئی۔ ہمارے نزدیک اپنی اور غیروں کی حکومت میں فرق ہی یہ ہوتا ہے کہ ہم اپنی حکومت کی خامیوں کو خود درست کر سکتے ہیں اور غیروں کی حکومت اس قسم کی کوششوں کو مداخلت سمجھتی ہے۔ پاکستان میں ہم سب ایک کشتی کے سوار ہیں اور ہمیں میں سے کچھ لوگ اس کشتی کے ناخدا بنا دیئے گئے ہیں۔ اگر ہم کسی وقت دیکھیں کہ ناخدا کا ہاتھ غلط اٹھ رہا ہے یا اس کے بادبان میں شگاف آرہے ہیں یا کشتی کا رخ اپنی منزل سے دوسری طرف مڑ رہا ہے، یا کشتی کے تختوں کی بوسیدگی سے اس میں پانی آجانے کا خطرہ ہے تو ہم میں سے ہر ایک کا فریضہ ہے کہ اس کے متعلق آواز اٹھائیں اور کشتی کے نقائص کو درست کرنے کی ہر ممکن کوشش کریں۔ اگر کوئی ملاح اس قسم کی آواز پر چیں بجبیں ہوتا ہے تو وہ نہ صرف یہ کہ کشتی کے مسافروں ہی کا بہی خواہ نہیں وہ خود اپنا اور کشتی کا خیر خواہ بھی نہیں سمجھا جا سکتا۔ طلوع اسلام نے اپنی اس مختصری زندگی میں امکان بھر کوشش کی ہے کہ وہ کشتی اور اس کے تضمنات کی مختلف جزئیات پر نگاہ رکھے اور اسے جہاں جہاں خامیاں نظر آئیں ان کے متعلق ملاحوں کو آگاہ کر دے۔ اگر کسی ملاح نے اس پر برا منایا ہے تو ہم اس کی خدمت میں نہایت سوز و اخلاص سے عرض کریں گے کہ ہمیں آپ کی برافروختگی کے مقابلہ میں کشتی کی عافیت زیادہ عزیز ہے۔

لیکن ملک میں کچھ عنصر ایسا بھی ہے جو ملاحوں کی ان خامیوں کو پیش کر کے شور مچاتا ہے کہ انھیں برطرف کرو اور ان کی جگہیں ہمیں دے دو۔ طلوع اسلام ان کے مسلک کی بھی مخالفت کرتا ہے۔ بات بالکل واضح ہے اور ہمیں اس کے اعتراف میں کچھ تامل یا باک نہیں ہونا چاہئے جس قسم کا دودھ ہوگا اسی قسم کی بالائی ہوگی۔ ہمارے ارباب حل و عقد ہمیں میں سے ہیں اور ہماری ہی قوم کے پیداوار۔ قوموں کی زندگیوں میں یہ چیز تو کہیں صدیوں میں ہوتی ہے کہ کوئی فرد ایسا پیدا ہو جائے جو قوم کی سطح سے بلند ہو۔ اسے نابغہ (Genius) کہتے ہیں اور نابغہ کی پیدائش خوارق عادات میں سے ہوتی ہے۔ ورنہ عام معمول یہی ہے کہ جس قسم کی قوم اسی قسم کے ان کے نمائندے۔ لہٰذا ہم اگر اپنے ارباب اختیار کے نقائص کو دیکھ کر ان کا گلا دبانے کی فکر کریں تو یہ ایسا ہی ہے جیسے کسی حبشی نے آئینہ میں اپنی شکل کو دیکھ کر آئینے کو پتھر پر دے مارا تھا۔ ہم یہ بھول جاتے ہیں کہ ہمارے ارباب اقتدار خود ہمارا ہی عکس ہیں۔ ہمیں بلاشبہ ان کی خامیوں پر انھیں متنبہ کرتے رہنا چاہئے جس طرح ہم اپنے ذاتی نقائص کی اصلاح کے لئے اپنے آپ کو متنبہ کرتے رہتے ہیں لیکن یہ کوشش غلط ہے کہ انھیں برطرف کر کے ان کی جگہ خود بیٹھ جانے کی کوشش کریں قوم کی موجودہ حالت کے پیش نظر جو تبدیلی بھی آپ کریں گے وہ اسی قسم کی ہوگی۔ اس لئے ہماری کوشش یہ ہونی چاہئے کہ پاکستان کی مملکت کو غیروں کی نظر بد سے بچانے کی پوری پوری تدابیر کریں اور اپنی آنے والی نسلوں کی ذہنی اور قلبی سطح کو بلند کرنے کی فکر کریں۔ اس کے ساتھ ساتھ ارباب اقتدار کو اتنا ضرور چاہئے کہ وہ قوم کو ذلیل اور اپنے آپ کو بلند نہ سمجھنے لگ جائیں۔ وہ بھی ایسے ہی ہیں جیسی قوم ہے۔ یہ غلط ہے کہ وہ قوم کے بہترین افراد ہیں اور ان کے بعد باقی قوم صرف تلچھٹ رہ گئی ہے۔ انھیں چاہئے کہ ان کی جن خامیوں کی طرف ان کی توجہ دلائی جاتی ہے ان کی اصلاح کی کوشش کریں اور اپنے آپ کو ہر اہم معاملہ میں ملت کے مشوروں کا محتاج سمجھیں۔ باہمی مشاورت سے بہت سے کام اس حسن و خوبی سے سرانجام پا جاتے ہیں جو انفرادی کوششوں سے ممکن ہی نہیں ہوتے۔

لیکن طلوعِ اسلام سے نہ اربابِ اقتدار خوش ہیں اور نہ ان پر تنقید کر کے ان کی جگہ لینے والا طبقہ۔ طلوعِ اسلام کو اس پر افسوس ضرور ہوتا ہے لیکن رنج نہیں ہوتا۔ اسلئے کہ اس کے پیشِ نظر افراد کی خوشنودی نہیں ملت کی بہبودی اور نوعِ انسانی کی فلاح ہے۔

تشکیلِ پاکستان کے بعد نیشنلسٹ علما کا وہ خطرہ تو وہیں رہ گیا جس کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے۔ لیکن شومئی قسمت سے اسلامی جماعت کا خطرہ اس کے پیچھے ہی رہا اور حیرت بالائے حیرت یہ کہ یہاں پہنچ کر وہ آتشِ خاموش شعلہ جوالہ بن کر بھڑک اٹھی۔ چونکہ اسلامی جماعت کا ہاتھ عوام کے جذبات کی دکھتی ہوئی رگ پر ہے اسلئے اس مسئلہ پر ذرا تفصیل سے گفتگو کرنے کی ضرورت ہے۔ ہمارے تجزیہ کی رو سے یہ جماعت دو قسم کے عناصر پر مشتمل ہے۔ ایک عنصر تو وہ ہے جو پہلے دن سے پاکستان کی تحریک کا دشمن ہے۔ آپ ترجمان القرآن اور مودودی صاحب کی دیگر تصانیف کو اٹھا کر دیکھئے۔ آپ دیکھیں گے کہ انھوں نے مسلم لیگ، قائدِ اعظم مرحوم اور تحریکِ پاکستان کے خلاف کس قدر زہر اگلا ہے اور ان کی یہ روش ایک یا دو دن نہیں رہی بلکہ تحریکِ پاکستان کی ابتدا سے لیکر تشکیلِ پاکستان تک یہ مسلسل اور متواتر اپنی انہی مذموم کوششوں میں مصروف رہے۔ یہ چیز ان کے خلاف نہ کوئی بہتان ہے نہ الزام۔ ان کی تحریریں موجود ہیں جس کا جی چاہے اٹھا کر دیکھ لے۔ وہ لوگ بھی موجود ہیں جو محفلوں میں ان کی گفتگو اور چھوٹے موٹے جلسوں میں ان کی تقریریں بھی سنا کرتے تھے۔ وہ تمام اس پر شاہد ہیں کہ تحریکِ پاکستان متعلق ان کے خیالات کیا تھے اور اس کی مخالفت میں یہ اعلانیہ کہتے رہے کہ

> مسلمان ہونے کی حیثیت سے میرے لئے اس مسئلہ میں بھی کوئی دلچسپی نہیں ہے کہ ہندوستان میں جہاں جہاں مسلمان کثیر التعداد ہیں وہاں ان کی حکومت قائم ہو جائے۔

پھر یہ بھی کہ

> مسلمان ہونے کی حیثیت سے میری نگاہ میں اس سوال کی بھی کوئی اہمیت نہیں ہے کہ ہندوستان ایک ملک رہے یا دس ٹکڑوں میں تقسیم ہو جائے۔

وہ تحریکِ پاکستان کو ہمیشہ غیر اسلامی قرار دیتے تھے اور یہ کہا کرتے تھے:

> یہ اسکیم دراصل ان لوگوں کے دماغ کی پیداوار ہے جن کے ذہن کی ساری تربیت مغربی اثرات کے تحت ہوئی ہے اور جنھوں نے تمدن و سیاست کے متعلق تمام تصورات یورپ کی تاریخ اور علومِ عمران سے سیکھے ہیں۔

اس تحریک کے قائد کے متعلق وہ اٹھتے بیٹھتے کہا کرتے تھے کہ وہ

> اسلام کی الف بے تک سے ناواقف ہے۔ [1]

---

[1] ان اقتباسات کے لئے دیکھئے ترجمان القرآن دسمبر ۱۹۳۹ء مئی، جون ۱۹۴۰ء، دسمبر ۱۹۴۰ء، جنوری ۱۹۴۱ء۔

یہ عنصر جو تقسیم ہند کے آخری لمحہ تک پاکستان کے خلاف اسی قسم کی زہر افشانیوں میں مصروف تھا پاکستان بننے کے بعد جھٹ سے پہلے آدھمکا، اور اس کے بعد مطالبہ یہ شروع کر دیا کہ پاکستان کی حکومت ہمارے حوالے کر دو۔ ہمارا خیال ہے کہ تاریخ نے انسانی کردار کی ایسی مثال بھی بہت کم پیش کی ہوگی۔ ہمارے نزدیک نیشنلسٹ علماء ان لوگوں سے کہیں بہتر ثابت ہوئے کہ انھوں نے اگر پاکستان کی مخالفت کی تو اس کے بعد وہ آج تک اس کے مخالف چلے آرہے ہیں لیکن انھیں دیکھئے کہ یہ پاکستان کی مخالفت میں ان سے بھی پیش پیش تھے لیکن اب ان کا مطالبہ یہ ہے کہ پاکستانی حکومت حق بھی ان کا ہے۔ ان کا دعویٰ یہ تھا کہ اگر ایک مٹھی بھر جماعت بھی صحیح معنوں میں مسلمان ہو جائے تو ہندوؤں کی مجال نہیں کہ اپنی حکومت قائم کر سکیں۔ ہندوستان میں اس وقت بھی تین چار کروڑ مسلمان موجود ہیں۔ اور وہ ہندوؤں کے استبداد سے پس رہے ہیں۔ اگر ان لوگوں کو اپنے اصول کا ذرا سا بھی پاس ہوتا اور اپنے مقصد کو دیانت پر مبنی سمجھتے تو ان کے لئے کرنے کا کام یہ تھا کہ ہندوستان میں رہ کر وہاں کے تھوڑے سے مسلمانوں کو سچے معنوں میں مسلمان بنا دیتے تاکہ وہاں ہندوؤں کی جگہ مسلمانوں کی حکومت قائم ہو جاتی۔ لیکن اب یہ تمام باتیں بھلائی جا چکی ہیں اور اپنی ساری توجہات پاکستان کی حکومت کی کرسیوں کی طرف مبذول کی جا رہی ہیں۔

کہا جاتا ہے کہ اس چیز کو چھوڑو کہ انھوں نے اس وقت کیا کہا اور کیا کیا۔ اب ان کی یہ کوشش ہے کہ پاکستان کو تعلیم و تربیت اور اخلاقی اصلاح کے ذریعہ سے اسلامی اسٹیٹ میں تبدیل کر دیا جائے۔ یہ کوشش تو بڑی مستحسن ہے۔ اس کے خلاف تو کوئی اعتراض نہیں ہونا چاہئے۔ لیکن ذرا سنئے کہ اس باب میں بھی ان لوگوں کی کیا حیثیت ہے۔ ابوالاعلیٰ صاحب مودودی ترجمان القرآن بابت اگست ۱۹۴۰ء میں ارشاد فرماتے ہیں:

> بعض لوگ یہ خیال ظاہر کرتے ہیں کہ ایک دفعہ غیر اسلامی طرز پر ہی مسلمانوں کا قومی اسٹیٹ قائم تو ہو جائے پھر رفتہ رفتہ تعلیم و تربیت اور اخلاقی اصلاح کے ذریعہ سے اس کو اسلامی اسٹیٹ میں تبدیل کیا جا سکتا ہے۔ مگر میں نے تاریخ، سیاسیات اور اجتماعیات کا جو تھوڑا بہت مطالعہ کیا ہے اس کی بنا پر میں اس کو ناممکن سمجھتا ہوں۔ اور اگر یہ منصوبہ کامیاب ہو جائے تو میں اس کو ایک معجزہ سمجھوں گا۔

اس سے صاف ظاہر ہے کہ مودودی صاحب کے نزدیک پاکستان کا اسلامی سٹیٹ میں تبدیل ہو جانا ناممکن ہے۔ وہ اسی دلیل کی بنا پر لوگوں کو پاکستان کی تحریک سے برگشتہ کیا کرتے تھے۔ اب سوال یہ ہے کہ جو چیز کل تک مودودی صاحب کے نزدیک ناممکن تھی اور ایسی ناممکن جیسا آج معجزہ کا وقوع ناممکن ہے، آج وہی چیز اس قدر ممکن بلکہ سہل الحصول کس طرح ہو گئی کہ مودودی صاحب اس تحریک کے پیش رو بن رہے ہوں۔ ہمیں مودودی صاحب پر افسوس نہیں کہ وہ کیا کچھ کہا کرتے تھے اور اب کیا کچھ کر رہے ہیں۔ ہمیں افسوس ہے اس قوم پر جس کی سمجھ میں اس قدر کھلی ہوئی بات بھی نہیں آتی کہ ایک شخص کل تک یہ کہہ رہا تھا کہ اخلاقی اصلاح کے

ذریعے پاکستان کو اسلامی اسٹیٹ میں تبدیل کرنا ناممکن ہے، وہی شخص آج لوگوں کو دعوت دے رہا ہے کہ میرے پیچھے چلو، میں اخلاقی اصلاح کے ذریعہ پاکستان کو اسلامی اسٹیٹ بنا دوں گا۔

یہ تو ہے اسلامی جماعت کا ایک عنصر۔ دوسرا عنصر ان جذبات پرستوں کا ہے جو محض اس نعرے کے ماتحت کہ ہماری حکومت شریعت کے مطابق ہونی چاہئے ان کے پیچھے لگ گئے ہیں۔ وہ مخلص ہیں لیکن سطح سے نیچے جانے کی صلاحیت نہیں رکھتے اور یہی وہ لوگ ہیں جن کے جذبات سے یہ پہلا عنصر کھیل رہا ہے۔ سطحی مقبولیت (Cheap Popularty) کی طرح سطحی مذہبیت (Religio sity) بھی بڑی سہل الحصول اور خوش آئند تدبیر ہوتی ہے۔ اسلامی جماعت کی ٹکنیک یہ ہے کہ وہ سطحی مذہبیت کی راہ سے عوام میں مقبولیت حاصل کرے اور اس طرح ان کے جذبات کی قوتوں کے ذریعہ اپنے مقاصد بروئے کار لے آئے۔ ہمیں اپنی قوم کے اس دوسرے طبقے سے دلی ہمدردی ہے اور اس احساس سے ہمیں سخت اذیت پہنچتی ہے کہ ان مخلص مسلمانوں کو کس بری طرح سے Exploit کیا جا رہا ہے۔ تاریخ بتاتی ہے کہ جن مفاد پرست افراد نے عوام کے جذبات کو اپنے مقاصد کے حصول کا ذریعہ بنایا وہ قوم کے لئے بڑے خطرے کا موجب ثابت ہوئے۔

یہ ہیں وہ وجوہات جن کی بنا پر طلوعِ اسلام اس جماعت کی مخالفت کرتا ہے۔ اگر ملک کے سنجیدہ طبقے کی سمجھ میں یہ بات آسکتی ہے تو طلوعِ اسلام کو اس سے خوشی ہے کہ اس سے پاکستان بہت سے نقصانات سے بچ جائے گا، اور اگر وہ اس سے متفق نہیں ہیں تو طلوعِ اسلام اس چیز کو علی وجہ البصیرت حق سمجھتا ہے وہ اسے دہرائے چلا جائے گا خواہ اس کی کوئی سنے خواہ نہ سنے کہ حق کی آواز کے سامعین بعد میں پیدا ہوا کرتے ہیں۔

تشکیلِ پاکستان کے بعد سب سے اہم مسئلہ آئین پاکستان کی تدوین کا ہے، بلکہ یوں سمجھئے کہ اصل مسئلہ ہی یہ ہے۔ پاکستان کی تشکیل تو اس کا پیش خیمہ تھی۔ چونکہ قوم ابھی ابھی غلامی کی نیند سے جاگ کر اٹھی ہے بلکہ یوں کہئے کہ "ہیں خواب میں ہنوز جو جاگے ہیں خواب میں" نیند کا خمار ابھی اترا ہی نہیں، اس لئے وہ اس مسئلہ کی اہمیت کو کما حقہ نہیں پہچان سکے۔ قوم نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ یہ ایک فرضِ کفایہ ہے جسے ان کی طرف سے مجلس دستور ساز کے اراکین ادا کر رہے ہیں، اور مجلس دستور ساز کے اراکین نے یہ سمجھ لیا کہ یہ بات ہی کون سی ہے۔ مختلف ممالک سے کانسٹی ٹیوشن سے متعلق کتابیں آجائیں، بس اس کے بعد کانسٹی ٹیوشن تیار ہو جائے گی۔ چنانچہ ان سے جب کبھی کسی نے پوچھا کہ تدوین دستور پاکستان کس منزل میں ہے تو یہی جواب دیتے رہے کہ ہمارے پاس کتابیں ہی نہیں، حالانکہ پاکستان کی جداگانہ مملکت کے لئے دلیل ہی یہ دی جاتی تھی کہ ہم اسے اسلامی نظام کی تجربہ گاہ بنانا چاہتے ہیں جو اس وقت دنیا میں کہیں موجود نہیں اور جو دنیا کے ہر آئین سے نرالا اور اعلیٰ اور ارفع ہوگا۔ تین برس تک یہ حضرات اسی تگ و تاز میں مصروف رہے اور اس کے بعد

جو کچھ پیش کیا اس کے متعلق ہر ایک کو علم ہے، کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔

قوم میں سے جس طبقہ نے آئین سازی کے متعلق شور اٹھایا وہ بیشتر اسلامی جماعت والوں ہی کا طبقہ تھا۔ ان کا مطالبہ یہ تھا کہ پاکستان میں شریعت کا نظام ہونا چاہیئے اور شریعت کا نظام وہی لوگ مدون کرسکتے ہیں جو شریعت سے واقف ہوں اور شریعت سے واقف ارباب شریعت ہیں جن کی نمائندگی اسلامی جماعت کرتی ہے۔ چنانچہ انھوں نے یہاں تک بھی مطالبہ شروع کردیا کہ مجلس دستورساز کا انتخاب نئے سرے سے ہونا چاہیئے اور اس میں انہی لوگوں کو آنے دینا چاہیئے جو شریعت سے واقف ہوں۔

ان سے پوچھا گیا کہ شریعت کسے کہتے ہیں۔ اس کے جواب میں انھوں نے کہا کہ شریعت کے مستقل ماخذ دو ہیں؛ قرآن اور روایات۔ قرآن میں صرف اصول ہیں، اس لئے شریعت کی جزئیات کا مستقل ماخذ روایات ہیں۔

کہا گیا کہ کیا روایات کے موجودہ مجموعوں میں سب روایات صحیح ہیں اور مستقل شریعت کی حیثیت رکھتی ہیں؟ جواب ملا کہ نہیں ان میں صحیح بھی ہیں اور غلط بھی۔

پوچھا گیا کہ صحیح اور غلط کا معیار کیا ہے؟ جواب ملا کہ اس کے لئے کوئی خارجی معیار نہیں۔ جو شخص رسول اللہؐ کا مزاج شناس ہو، وہ اپنے ذوق کی بنا پر کہہ سکتا ہے کہ کونسی روایت صحیح ہے اور کونسی غلط۔ اور اگر کہیں کوئی روایت نہ ملے تو وہ از خود بتا سکتا ہے کہ ایسے مقام پر رسول اللہ صلعم کیا فیصلہ دیتے۔ لہٰذا شریعت کا مستقل ماخذ اس شخص کا ذوق ہے[1]۔

یہ ہے اس شریعت کا تصور جسے یہ حضرات اسلامی نظام کے نام سے مسلمانوں پر مسلط کرنا چاہتے ہیں۔ یہ خالص خدائی اختیارات ہیں جن کا تصور تک بھی کوئی مسلمان نہیں کرسکتا۔ طلوع اسلام نے مسلسل تین برس اپنی اس کوشش کو جاری رکھا کہ مسلمانوں کی نگاہوں کے سامنے اس حقیقت کو واضح کردے کہ اسلامی نظام کے مستقل، غیر متبدل اور ابدی اصول قرآن کریم کے اندر ہیں اور ہر زمانے کے مسلمان اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق ان اصولوں کی روشنی میں جزئی قوانین خود مرتب کرسکتے ہیں۔ البتہ ان قوانین کی ترتیب میں ان قوانین سے بطور نظائر و مویدات (Precedents) مدد لی جاسکتی ہے جو اس سے پہلے کسی اسلامی حکومت نے مرتب کئے ہوں۔ انہی قوانین کا نام شریعت ہوگا اور ان کو نافذ کرنے والے نظام کا نام اسلامی نظام۔ طلوع اسلام کی یہ آواز شروع شروع میں بڑی نامانوس سی محسوس ہوتی رہی۔ لیکن اللہ کی توفیق سے اب اس آواز نے ایک خاص فضا پیدا کردی ہے اور ملک کے دور دراز گوشوں سے اس کی بازگشت صدائیں سنائی دینے لگ گئی ہیں۔ یہ عنوانات بڑے امید افزا اور حوصلہ بخش ہیں۔

طلوع اسلام نے بنیادی اصولوں کی رپورٹ کے خلاف جو تنقید شائع کی تھی وہ اسی مسلک کی تفسیر تھی۔ مقام مسرت ہے کہ اس کے بعد ذمہ دار حلقوں نے اس ضرورت کو محسوس کیا کہ تدوین دستور کے مسئلہ میں ملت سے مشورہ لینا بھی ضروری ہے۔ چنانچہ

---

[1] تفصیل ان امور کی "مسئلہ سو" کے مقالہ میں دیکھئے جو چند صفحات آگے آپ کے سامنے آئے گا۔

اس ضرورت کے ماتحت مجلس دستور ساز نے اعلان کیا ہے کہ جو لوگ چاہیں دستورِ پاکستان کے متعلق اپنے مشورے ۳۱ جنوری ۱۹۵۱ء تک بھیج دیں۔ طلوعِ اسلام تنقید کے علاوہ قرارداد مقاصد کا مسودہ بھی پیش کر چکا ہے۔ اب اس کے سامنے ان بنیادی اصولوں کی تدوین کا مسئلہ ہے جن کی روشنی میں آئین کی جزئیات مدون ہونی چاہئیں تھیں۔ طلوعِ اسلام کی تجویز ہے کہ ان بنیادی اصولوں کا ایک پورا خاکہ مرتب کر کے مجلس دستور ساز کے پاس بھیجا جائے اور پھر اسے طلوعِ اسلام میں بھی شائع کر دیا جائے۔ جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے اس کی آخری تاریخ ۳۱ جنوری ہے۔ اس لئے ہو سکتا ہے کہ طلوعِ اسلام کا آئندہ پرچہ جس میں یہ دستوری خاکہ شامل ہو کچھ دیر کے ساتھ شائع ہو سکے۔ اس کے لئے پہلے اطلاع دینا اس لئے ضروری سمجھا گیا کہ ہمیں احباب کی کاوشِ انتظار کا پورا پورا احساس رہتا ہے۔ یہ بھی تجویز ہے کہ طلوعِ اسلام میں شائع شدہ تنقید، قراردادِ مقاصد اور مجوزہ دستوری خاکے کو ایک پمفلٹ کی شکل میں الگ بھی شائع کیا جائے —— اردو اور انگریزی دونوں زبانوں میں الگ الگ۔

احباب کی طرف سے بار بار تاکید موصول ہو رہی ہے کہ قرآنی نظام کے خیال کو عام کرنے کے لئے ایک جماعت کی ضرورت ناگزیر ہے۔ یہ درست ہے لیکن ہم تو طلوعِ اسلام کے قارئین کو خود ایک جماعت سمجھتے ہیں۔ ہمارے نزدیک جماعت رکنیت کے چندے سے وجود میں نہیں آتی، فکر و نظر کی ہم آہنگی سے متشکل ہوتی ہے۔ اگر قارئین طلوعِ اسلام، طلوعِ اسلام کے پیش کردہ تصورات سے ہم آہنگ ہیں تو یہ تمام کے تمام ایک جماعت کے ارکان اور ایک ہی تسبیح کے دانے ہیں۔ اس کے علاوہ اور جماعت کسے کہتے ہیں۔ آپ ان خیالات کو حق پر مبنی سمجھتے ہیں تو اپنے اپنے حلقہ میں انہیں عام کیجئے اور پھر مجلس دستور ساز کی توجہ اس طرف منعطف کرائیے یہی کام جماعتی ہو جائے گا۔

یہ ہے بہر حال ایک مختصر سا جائزہ ان حقیر اور ناتمام کوششوں کا جو طلوعِ اسلام نے ۱۹۴۸ء سے آج تک اپنے مقصد پیش نظر کے حصول کے لئے کیں۔ اس کے بعد اس کے کیا عزائم ہیں وہ بھی کوئی راز مستور نہیں۔ جیسا کہ کہا جا چکا ہے اس کے سامنے تو ایک ہی مقصد ہے، ایک ہی نصب العین ہے، ایک ہی منزل ہے، اس منزل تک پہنچنا اس کے عزائم کا حاصل ہے۔ لیکن وہ منزل ایسی نہیں کہ جہاں پہنچ کر ذوقِ سفر ختم ہو جاتا ہے۔ وہ منزل حریمِ کعبہ ہے جہاں پہنچ کر رک جانے کی بجائے طواف شروع ہو جاتا ہے۔ قرآنی نظام پتھر کا مجسمہ نہیں کہ جسے ایک مرتبہ مکمل کر کے رکھ دیا جائے اور پھر وہ صدیوں تک ساکت و صامت، جمود و خمود کا پیکر بنے پڑا رہے۔ وہ نظام تو ایک جسم نامی (Organised) ہوتا ہے جس میں ہر آن نشو و ارتقا ہوتا رہتا ہے۔ انسانی زندگی کے تقاضے کہیں بھی ختم نہیں ہو جاتے۔ اس لئے ان تقاضوں کی تسکین کا سامان فراہم کرنے والا نظام کس طرح کسی ایک نقطہ پر پہنچ کر رک سکتا ہے۔ اس لئے جو دعوت قرآنی نظام کے قیام کے لئے بلند ہوتی ہے وہ کہیں جا کر ختم نہیں ہوتی۔ وہ انسانیت کے قافلہ کے آگے آگے چلتی ہے اور یہ کارواں فلک در فلک اپنی منازل طے کرتا ہوا بلند سے بلند تر مقامات کی طرف جادہ پیما رہتا ہے۔

طلوعِ اسلام کی آرزو ہے کہ اللہ تعالیٰ اسے یہ توفیق عطا فرمائے کہ وہ اس دعوت کا نقیب بنا رہے۔

ان حسین تمناؤں اور مقدس آرزوؤں کے ساتھ طلوعِ اسلام اپنی نشاۃ ثانیہ کی چوتھی منزل میں قدم رکھتا ہے۔

ربنا تقبل منا انك انت السميع العليم۔

سب کچھ خدا سے مانگ لیا تجھ کو مانگ کر اٹھتے نہیں ہیں ہاتھ مرے اس دعا کے بعد

پچھلے دنوں اخبارات میں یہ اطلاع شائع ہوئی تھی کہ حکومت ایک کمیٹی مقرر کرنا چاہتی ہے جو ملک کے مروجہ قوانین میں مناسب ردوبدل کی سفارشات کریگی۔ یہ کمیٹی سید سلیمان ندوی صاحب کی زیرِ قیادت کام کرے گی۔

ہمارا خیال ہے کہ جس طرح حکومت اس وقت تک تدوین دستورِ پاکستان کے سلسلہ میں ایسے غلط اقدام کر چکی ہے جن کا نتیجہ ایضاعِ مال اور وقت کے سوا کچھ برآمد نہیں ہوا، اسی طرح تجدید قوانین کا یہ مجوزہ قدم ہے۔ سب سے پہلے یہ امر قابلِ غور ہے کہ وہ کون سے اصول ہیں جن کے پیشِ نظر یہ کمیٹی مروجہ قوانین کی چھان بین کرے گی؟ کہدیا جائے گا کہ یہ کمیٹی دیکھے گی کہ مروجہ قوانین میں سے کون کون سے قانون اسلام کے خلاف ہیں اور ان میں کیا کیا ردوبدل کیا جائے تاکہ یہ اسلام کے مطابق ہو جائیں۔ لیکن پہلا سوال تو یہ ہے کہ جب آپ کہتے ہیں کہ قوانینِ ملک کو اسلام کے مطابق ہونا چاہیئے تو اسلام سے آپ کی مراد کیا ہوتی ہے؟ آپ اس دشواری کو دستورِ پاکستان کی تدوین کے سلسلہ میں خود دیکھ چکے ہیں حالانکہ دستور، صرف اصولوں کی روشنی میں مرتب ہوا کرتا ہے۔ اسے جزئیات سے بحث نہیں ہوتی۔ لیکن اس کے برعکس، قوانین ان جزئیات کا نام ہوتا ہے جو اصولوں کی رو سے مرتب کی جاتی ہیں۔ سو جب آپ ابھی تک یہی طے نہیں کر سکے کہ دستورِ پاکستان کے سلسلہ میں اسلام کے اصول کیا ہیں تو آپ اسلامی قوانین کس طرح مرتب کر سکیں گے؟ شیعہ اور سُنی کے دو فرقوں کو الگ الگ بھی رکھ دیا جائے تو بھی خود سنیوں میں اہلِ حدیث کے نزدیک اسلامی قوانین کچھ اور ہیں اور اہلِ فقہ کے نزدیک کچھ اور۔ پھر اہلِ فقہ میں، حنفی قانون اور ہے اور شافعی اور۔ مالکی اور ہے اور حنبلی اور۔ اب سوال یہ ہے کہ آپ ان میں سے کس کے قوانین کے مطابق ملک کے قوانین کو بدلنا چاہتے ہیں؟ یہ ظاہر ہے کہ اگر اس کام کو سید سلیمان ندوی صاحب کے سپرد کیا جائے گا تو وہ فقہ حنفی کے مطابق قوانین مرتب کر دیں گے۔ تو کیا آپ یہ فیصلہ کر چکے ہیں کہ پاکستان کا قانون فقہ حنفی کا قانون ہوگا؟ آپ کی اطلاع کے لئے عرض ہے کہ افغانستان کا قانون فقہ حنفی کا قانون ہے لہٰذا پاکستان کا قانون بھی ویسا ہی ہوگا جیسا افغانستان کا مروجہ قانون ہے!

اس گذارش سے مقصود صرف یہ ہے کہ حکومت کو چاہیئے کہ یونہی بوکھلاہٹ میں یہ کچھ نہ کرتی رہے بلکہ پہلے اچھی طرح سے متعین کرلے کہ مقصد پیشِ نظر کیا ہے اور پھر اس مقصد کے حصول کی کوشش کرے۔ ورنہ اگر اس نے یہ سلسلہ یونہی علی الحساب جاری رکھا تو اس کے نتائج بڑے نقصان رساں ہوں گے۔ وہ اس سے قبل "اسلامی تعلیمات بورڈ" کا تجربہ حاصل کر چکی ہے۔ یہ تجربہ اس سے بھی زیادہ تلخ ہوگا۔ ہمارا اندازہ یہ ہے کہ "تعلیمات بورڈ" نے جو سفارشات کی ہوں گی، حکومت نے انھیں اس لئے قابلِ قبول نہیں سمجھا ہوگا کہ وہ اس قابل ہی نہیں ہوں گی کہ ہمارے دور کے تقاضوں کے پیشِ نظر انھیں ممکن العمل بنایا جا سکے۔ اگر یہی صورت تھی تو

وہ دیکھیں گے کہ سید سلیمان ندوی صاحب جو قوانین مرتب کرکے دیں گے وہ ان سے بھی کہیں زیادہ فرسودہ اور جامد ہوں گے اور وہ چھچھوندر کی طرح حکومت کے گلے میں اٹک جائیں گے کہ نہ نگلے بنے نہ اُگلے۔ عوام اُنھیں اسلامی قوانین سمجھ کر ان کے نفاذ کا تقاضا کریں گے اور حکومت کی مشکل یہ ہوگی کہ اس قسم کے ناممکن العمل قوانین کو نافذ کیسے کیا جائے! ہم سید صاحب کا احترام کرتے ہیں لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی سمجھتے ہیں کہ ہر کارے و ہر مردے۔ سید صاحب بڑے عمدہ کیٹلاگر (Cataloguer) ہیں۔ وہ یہ بتا سکتے ہیں کہ فلاں بات کس کس کتاب میں ملے گی۔ لیکن وہ نہ تو روشِ عامہ سے ایک انچ بھی ادھر اُدھر ہٹ سکتے ہیں اور نہ ہی ان کی اپنی فکر ہے۔ روشِ عامہ کی تقلید میں تو ان کا یہ عالم ہے کہ آپ سیرۃ النبیؐ کی جلدوں کو اٹھا کر دیکھئے۔ آپ کو ان میں بھی اسی قسم کی توہم پرستانہ قصے کہانیاں نظر آئیں گی جو قصص الانبیاء کی عام کتابوں میں دکھائی دیتی ہیں۔ "جبریلؑ نے حضورؐ کا سینہ شق کرکے آپ کے دل کو زمزم کے پانی سے دھویا"۔ معراج کے وقت آپ کے لئے "گدھے سے بڑا اور خچر سے چھوٹا سپید رنگ کا لمبا جانور آیا جس کا نام براق تھا"۔ جبریلؑ نے آپؐ کے سامنے "دودھ اور شراب کے پیالے رکھے"۔ آپ اس مقام پر پہنچے "جہاں قلمِ قدرت کے چلنے کی آواز کانوں میں آرہی تھی"۔ یا پھر اس قسم کی باتیں کہ "حضورؐ کے پاس جنات آئے تو آپ نے اُنھیں گوبر اور ہڈی کا توشہ کھانے کو دیا"۔ یا یہ کہ "خشک کھجور کا تنا آپ کے فراق میں بچوں کی طرح روتا تھا"۔ "آپؐ درخت کی ٹہنی پکڑ لیتے تو وہ آپؐ کے پیچھے اونٹ کی طرح چل پڑتا"۔ آپ نے کھجور کے خوشے کو حکم دیا تو وہ خود بخود درخت سے اتر کر آپؐ کے پاس آگیا اور پھر واپس کھجور میں جا لگا"۔ "آپؐ نے پیالے میں ہاتھ ڈالا تو انگلیوں سے پانی کے چشمے جاری ہوگئے"۔ یا "ایک گونگے کو آپؐ نے اپنی کلی کا پانی پلایا تو وہ بولنے لگ گیا"۔ یا یہ کہ "کفار کی روحیں مرنے کے بعد فضائے زمین میں آوارہ پھرتی رہتی ہیں یا ان کی قبروں کے اوپر منڈلاتی رہتی ہیں"۔ اور "شہداء سبز پرندوں کی شکل میں اڑتے پھرتے ہیں اور عرشِ الٰہی کی قندیلیں ان کا آشیانہ ہوتی ہیں" وقس علیٰ ذالک۔ (مزید تفاصیل سیرۃ النبیؐ جلد سوم و چہارم میں ملاحظہ کیجئے)۔ یہی نہیں! اس باب میں تو سید صاحب کا یہ عالم ہے کہ ایمانیات تک میں بھی ان کے نزدیک مدار قرآن نہیں، مسلکِ عامہ ہے۔ جس شخص نے سرسری طور پر بھی قرآن پڑھا ہے وہ کم از کم اتنا تو جانتا ہے کہ قرآن نے ایمان کے پانچ اجزا مقرر کئے ہیں۔ اللہ پر ایمان۔ ملائکہ پر ایمان۔ کتابوں پر ایمان۔ رسولوں پر ایمان اور آخرت پر ایمان۔ ان پر ایمان لانے سے ایک شخص دائرۂ اسلام میں داخل ہو جاتا ہے اور ان سے انکار کرنے پر وہ اس دائرہ سے باہر نکل جاتا ہے۔ اس کے برعکس عجمیوں (مجوسیوں) میں ایمان کا مدار "خیر و شر" (تقدیر) کا مسئلہ تھا۔ جب اہلِ ایران مسلمان ہوئے ہیں تو انھوں نے اپنے اس قدیمی عقیدے کو عربوں میں پھیلا دیا۔ اور اس طرح مسلمانوں میں تقدیر کی بحث کی ابتدا ہوئی اور اس سے قدری فرقہ پیدا ہوا۔ اس فرقہ کے بانی (معبد بن خالد جہنی) نے اس مسئلہ کو اساورہ کے ایک شخص سے (جس نے اپنی کنیت ابو یونس رکھ لی تھی) اخذ کیا تھا۔ اساورہ ایران کے شاہی گارڈ کا نام تھا۔ ایران کی شکست کے بعد اس ایرانی فوج نے حضرت سعدؓ (فاتح ایران) سے خواہش کی کہ مسلمانوں کو جو دعائیں حاصل ہیں اگر ہمیں بھی عطا ہوں تو ہم مسلمان ہو کر اسلامی

آبادیوں میں جا بستے ہیں۔ چنانچہ یہ مسلمان ہو گئے اور انہوں نے مختلف بلادِ اسلامی میں پھیل کر خاموشی سے اپنے سابقہ عقائد کی نشر و اشاعت شروع کر دی۔ ان عقائد میں تقدیر کے مسئلے کو خاص اہمیت حاصل تھی چنانچہ انہی کے اثرات سے ہمارے ہاں قدری فرقہ پیدا ہوا۔ تقدیر کا مسئلہ (کہ جو کچھ ہوتا ہے خدا کی طرف سے ہوتا ہے) ملوکیت کی مفاد پرستی کو خاص طور پر راست آتا ہے اس لئے اس گوشہ سے اسے اور بھی تقویت ملی اور اس دوگانہ سازش کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہ مسلمانوں کے ایمان کا چھٹا جزو قرار پا گیا۔ یعنی پانچ اجزائے ایمان خدا کی طرف سے اور چھٹا جزو ایرانیوں کی طرف سے۔ چنانچہ اس کے بعد یہ چھ اجزاء ایمان کی شرائط قرار پا گئے۔ یعنی اٰمنت باللّٰہ۔ وملائکتہ وکتبہ۔ ورسلہ۔ والقدر خیرہ و شرہ من اللّٰہ تعالیٰ (ایرانی اضافہ) والبعث بعد الموت۔

سید سلیمان ندوی صاحب نے سیرۃ النبیؐ کی چوتھی جلد میں اسلامی عقائد سے بحث کی ہے اور ان میں تقدیر کو ایمان کا چھٹا جزو قرار دیا ہے اور اس کے لئے ایک مستقل باب وقف کیا ہے[1]۔ اور کتاب کے آخر میں لکھا ہے کہ

> گذشتہ صفحوں میں ایمان کی حقیقت اور اس کی چھ شاخوں، خدا۔ فرشتے۔ رسول۔ کتاب۔ یوم آخر اور قدر کی تفصیلات بیان کی گئی ہیں۔ (ص۸۵۳)

اس لئے کہ یہ مسلک ہمارے ہاں مروج چلا آ رہا ہے اسی لئے سید صاحب اس سے کس طرح ادھر اُدھر ہو سکتے ہیں۔

باقی رہا صاحبِ فکر ہونے اور حالاتِ حاضرہ پر نظر رکھنے کا سوال۔ سو سید صاحب کی تصانیف میں اس کی بیشتر مثالیں مل جائیں گی۔ مثلاً سید صاحب نے اپنی کتاب سیرۃ النبیؐ جلد سوم میں معجزات کے سلسلہ میں ہیوم وغیرہ کے اعتراضات کا جواب دیتے ہوئے خوارقِ عادت کے ثبوت (اور غالباً روح کے وجود کی تائید) میں حسب ذیل دلیل پیش فرمائی ہے۔ تحریر ہے

> تو می تجربات کے علاوہ بھی کچھ نہ کچھ ایسے پُر اسرار واقعات مشاہد و مسموع ہوتے رہتے ہیں جن کی توجیہ عام قوانین فطرت سے نہیں ہوتی اور جو بہت سے معجزات کے متعلق ہماری حیرت و استبعاد میں کمی پیدا کرتے رہتے ہیں۔

---

[1] سید صاحب نے سہواً ایسا نہیں کیا۔ اس لئے کہ جب حافظ اسلم جیراجپوری صاحب نے ان کی کتاب پر تنقید کرتے ہوئے اس غیر قرآنی جزو ایمان کی طرف ان کی توجہ مبذول کرائی تو سید صاحب نے اپنے برسرِ حق ہونے پر اصرار کیا۔ (اگرچہ انھیں اپنے دلائل کی کمزوری کا احساس ضرور ہو گیا کیونکہ جب انھوں نے اس کے بعد انجمن اسلامی تاریخ و تمدن علی گڑھ کے زیر اہتمام "اسلامی ہفتہ" (ستمبر ۱۹۴۰ء) میں ایمان کے موضوع پر تقریر فرمائی تو اس کا اقرار کیا کہ اللہ تعالیٰ نے

> ایمان کے صرف پانچ اصول تلقین کئے ہیں۔ خدا پر ایمان۔ خدا کے فرشتوں پر ایمان۔ خدا کے رسولوں پر ایمان۔ خدا کی کتابوں پر ایمان اور اعمال کی جزا و سزا کے دن پر ایمان۔
>
> (پمفلٹ "ایمان" شائع کردہ انجمن مذکورہ صدر ص۱۶)

ہمارے صوبہ کے مشہور انگریزی اخبار "لیڈر" نے پچھلے سال اپریل میں بردوان کا ایک عجیب وغریب واقعہ چھاپا تھا جو نامہ نگار کے الفاظ میں حسب ذیل ہے۔

"بردوان میں ایک عجیب پراسرار واقعہ پیش آیا جس نے لوگوں میں کافی سنسنی پیدا کردی ہے۔ لالہ کندن کپور ایک کھتری زمیندار ۱۱ اپریل کو ۶ بجے شام کے وقت مرا۔ متوفی چونکہ سوریہ بنسی کھتری تھا اس لئے جب تک دوسرے دن صبح آفتاب نہ نکل لیا اس کی لاش جلائی نہیں گئی۔ جلانے سے پہلے اس کے لڑکے اندر لال نے ایک خالی کمرہ میں جہاں کوئی اور نہ تھا لاش کا فوٹو لیا لیکن اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب اس نے دیکھا کہ اس کے فوٹو پر پانچ اور دھندلی تصویریں آگئی ہیں ان تصویروں میں سے دو کو تو خاندان کے لوگوں نے پہچانا تھا کہ متوفی کی پہلی بیوی اور لڑکے کی ہیں جن کو مرے ہوئے کئی سال ہوچکے ہیں[1]۔ باقی تین تصویریں جو زیادہ روشن نہ تھیں پہچانی نہیں جا سکیں[2]"

وہ تھی سید صاحب کی تقلید جامد کی مثال اور یہ ہے ان کے بلیغ فکر کی مثال! اب آپ خود ہی سوچ لیجئے کہ اگر پاکستان کی قانون سازی کا کام ان کے سپرد کردیا جائے تو یہ کس قسم کا قانون مرتب کرکے دیں گے!

ہم اربابِ اختیار سے بادب گذارش کریں گے کہ وہ ان معاملات کو ذرا زیادہ غور وفکر سے طے کرنے کی کوشش کریں تاکہ ان کی محنت اور قوم کا روپیہ کوئی بہتر نتائج پیدا کرسکے۔ ویسے اگر مقصود محض عوام کو مطمئن رکھنا ہو تو پھر مولانا ابوالکلام آزاد کو کیوں نہ دعوت دیدی جائے۔ ان کی شہرت یقیناً ان سب سے زیادہ ہے۔ ان کے خلاف یہی اعتراض ہوسکتا ہے کہ وہ کانگرسی تھے۔ تو سید صاحب کونسے مسلم لیگی تھے؟ اور اگر یہ کہا جائے کہ وہ تو اب بھی کانگریسی ہیں۔ تو جس طرح پاکستان آنے کے بعد سید صاحب پاکستانی ہوگئے ہیں، انھیں پاکستانی بننے میں کونسی دیر لگے گی؟ بلکہ بہتر ہو کہ ان کے ساتھ مولانا حسین احمد صاحب مدنی، مولانا احمد سعید صاحب، مولانا حفظ الرحمٰن صاحب سیوہاروی و رفقاء ہم کو بھی بلالیا جائے۔ سید صاحب اور سید ابوالاعلیٰ صاحب مودودی پہلے ہی سے یہاں موجود ہیں۔ آئین وقانون کی باگ ڈور ان حضرات کے ہاتھ میں دیدی جائے۔ اللہ کی حکومت، اللہ کے نائبین کے سپرد بھی ہوجائے گی اور اس کے ساتھ ہی پاکستان اور ہندوستان کے تمام جھگڑے ٹنٹے بھی نپٹ جائیں گے۔ بس ذرا سا سوال یہ رہ جائیگا کہ پاکستان کے مسلمانوں کا کیا بنے گا؟ سو اس کے لئے تقدیر کا مسئلہ موجود ہے، مرضیٔ مولا از ہمہ اولیٰ۔ وہ جس حال میں رکھے، رہنا پڑے گا۔

---

[1] عام عقیدہ ہے کہ مرتے وقت مردہ رشتہ داروں کی روحیں آتی ہیں تاکہ وہ مرنے والے کی روح کو ساتھ لیجائیں۔
[2] ان میں سے غالباً ایک ملک الموت اور دو کراماً کاتبین ہوں گے!

"ناقابلِ فراموش انقلاب

جس نے اقوامِ عالم کے قلب پر ایک نرالا لیکن دائمی نقش ثبت کر دیا"

گبن

ان الفاظ میں اس انقلاب کا تذکرہ کرتا ہے۔ جسے

محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے پیدا کیا

اس ناقابلِ فراموش انقلاب کی روح پرور داستان کا حامل قرآن ہے۔

اس داستانِ انقلاب کو

جناب پرویز کے حقیقت نگار قلم نے اردو میں پیش کیا ہے۔

معراجِ انسانیت {معارف القرآن جلد چہارم}

میں اس داستان کو ملاحظہ کیجئے۔

قیمت بیس روپے۔ محصول ڈاک علاوہ

انبیائے سابقہ کی دعواتِ انقلاب

کو بھی اسی طرح جناب پرویز نے قرآن ہی کے ماخذ سے

تاریخِ رسالت {معارف القرآن جلد سوم}

کے نام سے پیش کیا ہے۔

قیمت پندرہ روپے۔ محصول ڈاک علاوہ

ادارہ طلوعِ اسلام۔ رابسن روڈ۔ کراچی۔

مثلہ معہٗ

(قرآن کے ساتھ، قرآن جیسی کچھ اور چیز بھی)

دین کے بنیادی گوشے کے متعلق ایک اہم بحث

اکتوبر ۱۹۵۰ء کے طلوعِ اسلام میں حسب ذیل شذرہ، قارئین کی نگاہ سے گذر چکا ہے:

حدیث کے مستقل ماخذ ہونے کی نفی سے اگر مراد یہ ہے کہ اس کی حیثیت صرف شارح اور مفسر کی ہے یعنی وہ انہی مسائل و قوانین کی وضاحت کرتی ہے جن کا مجملاً قرآن میں ذکر آگیا ہے اور خود اس کی اپنی مستقل حیثیت کچھ نہیں ہے تو یہ دعویٰ واقع کے خلاف ہے۔ اس بارے میں مندرجہ ذیل دلائل و نظائر قابلِ غور ہیں:

۱) مشہور حدیث ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، لوگو! میں تم میں دو چیزیں چھوڑ چلا ہوں، ان دونوں پر عمل کرتے رہو گے تو گمراہ نہ ہو گے۔ اللہ کی کتاب اور میری سنت۔

۲) مقدام بن معدی کرب سے سنن میں روایت ہے کہ آپ نے فرمایا، لوگو! مجھے قرآن دیا گیا ہے اور اس کے ساتھ اسی کے مثل کچھ اور بھی۔ اسی "کچھ اور" کو حدیث، سنت اور وحی خفی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ ان دونوں روایتوں کا اندازِ بیان بتلا رہا ہے کہ مسائل و احکام کے باب میں حدیث ایک مستقل ماخذ کی حیثیت رکھتی ہے۔

جب اس شذرہ کے جواب میں مدیر ترجمان القرآن کی طرف سے کوئی جواب موصول نہ ہوا اور نہ ہی ترجمان القرآن میں اس موضوع پر کچھ مزید شائع ہوا، تو ہم نے مسئلہ کی اہمیت کے پیشِ نظر انھیں ایک خط کے ذریعہ یاددہانی کرائی۔ اس خط کے جواب میں محترم مودودی صاحب نے ارشاد فرمایا ہے کہ "اس طرح کے سوالات کی جواب دہی میں اپنا وقت صرف کرنا میرے اصول کے خلاف ہے۔ اگر آپ ترجمان القرآن کا مطالعہ فرماتے رہے ہیں تو آپ کو میری روش کا اندازہ خود ہی ہو چکا ہو گا۔"

چونکہ جیسا کہ طلوعِ اسلام کے مندرجہ بالا اقتباس سے ظاہر ہے، ہمارے نزدیک مسئلہ زیرِ نظر دینی اعتبار سے بڑی اہمیت رکھتا ہے، اس لئے ہم نے ضروری سمجھا ہے کہ اس کے متعلق ذرا تفصیل سے گفتگو کی جائے۔ مودودی صاحب کے محولہ صدر جواب کے بعد ہمارے لئے ایک ہی صورت باقی رہ گئی تھی کہ ہم مسئلہ پیشِ نظر کے متعلق مودودی صاحب کی سابقہ تحریروں کی طرف رجوع کریں۔

ان کی سابقہ تحریروں میں سے اسوقت ہمارے سامنے "تفہیمات حصہ اول" ہے جس میں انھوں نے حدیث کی دینی حیثیت کے متعلق مختلف مقامات پر شرح وبسط سے بحث فرمائی ہے۔ (تفہیمات دراصل ترجمان القرآن میں شائع شدہ مضامین ہی کا مجموعہ ہے) مسئلہ زیر نظر کو ہم انہی تحریروں کی روشنی میں جانچتے ہیں تاکہ حقیقت کھل کر سامنے آجائے۔

قرآن کریم میں ہے:

والذین اٰمنوا وعملوا الصالحات واٰمنوا بما نزل علی محمدٍ وھو الحق من ربھم کفر عنھم سیاٰتھم واصلح بالھم (۴۷/۲)

اور جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے اعمال صالح کئے اور وہ ایمان لائے اس پر جو محمد پر نازل کیا گیا ہے۔ اور وہ ان کے رب کی طرف سے ایک حقیقت ہے۔ تو اللہ ان کی برائیاں ان سے دور کردیگا اور ان کی حالت درست رکھے گا۔

اس سے ظاہر ہے کہ "ما نزل علیٰ محمد" (جو کچھ محمد پر نازل کیا گیا تھا) پر ایمان لانا شرطِ اسلام ہے اور وہ خدا کی طرف سے حق ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ "ما نزل علی محمد" سے مراد کیا ہے؟ قرآن کا ایک ایک ورق اس پر شاہد ہے کہ اس سے مراد قرآن کریم ہے۔

یٰس۔ والقراٰن الحکیم۔ ..... تنزیل العزیز الرحیم (۳۶/۱-۵)

یہ قرآن حکیم خدائے عزیز ورحیم کی طرف سے نازل کیا گیا ہے۔

رسول اللہ پر یہ قرآن خدا کی طرف سے بذریعہ وحی نازل ہوا۔

قل اللہ شھید بینی وبینکم۔ واوحی الی ھذا القراٰن لاُنذرکم بہ ومن بلغ... (۶/۱۹)

ان سے کہو کہ میرے اور تمہارے درمیان اللہ گواہ ہے اور میری طرف یہ قرآن بذریعہ وحی اتارا گیا ہے تاکہ میں اس کے ذریعے تم کو اور جس جس کو یہ قرآن پہنچے (غیر فطری اعمال کے نتائج سے) آگاہ کروں۔

یعنی رسول اللہ پر قرآن بذریعہ وحی نازل ہوا اور قرآن ہی کے ذریعے لوگوں کو اسلام کی تبلیغ کی جائے گی، انھیں بھی جو رسول اللہ کے مخاطب تھے اور اُن تمام انسانوں کو بھی جو حضورؐ کے بعد آئیں گے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ بھی واضح طور پر فرمادیا کہ قرآن رسول اللہ کے اپنے خیالات کا مجموعہ نہیں بلکہ یہ خدا کی طرف سے بذریعہ وحی ملتا ہے۔

وما ینطق عن الھوی۔ ان ھو الا وحی یوحی۔ (۵۳/۳-۴)

رسول اپنی خواہش نفس سے باتیں نہیں کرتا بلکہ یہ قرآن وہ وحی ہے جو اس کی طرف بھیجی جاتی ہے۔

رسول اللہ کو اسی قرآن کی اتباع کا حکم دیا گیا تھا۔ واتبع ما یوحیٰ الیک من ربک (۳۳/۲) "جو کچھ تیرے رب کی طرف سے وحی کیا گیا ہے اور کسی چیز کی اتباع نہیں کرتا" (ان اتبع الا ما یوحی الی۔ ۴۶/۹) اسی قرآن کی پیروی کا حکم تمام مسلمانوں کو دیا گیا اور

خاص طور پر کہہ دیا گیا کہ اس کے سوا اوروں کی پیروی مت کرو۔

اتبعوا ما انزل الیکم من ربکم ولا تتبعوا من دونہ اولیاء (۷/۳)

جو تمہارے رب کی طرف سے تمہاری طرف نازل کیا گیا ہے تم اس کی اتباع کرو اور اس کے علاوہ اور اولیاء کی پیروی مت کرو۔

اس قرآن کے متعلق فرمایا گیا کہ اس کی مثل کوئی ایک بات (حدیث) بھی نہیں لائی جا سکتی۔

فلیأتوا بحدیث مثلہ ان کانوا صادقین (۵۲/۳۴)

اگر یہ لوگ سچے ہیں تو ان سے کہو کہ اس کے مثل کوئی ایک بات (حدیث) بھی لا کر بتائیں۔

اور اسی قرآن کی حفاظت کا ذمہ اللہ تعالیٰ نے لیا ہے۔ انا نحن نزلنا الذکر وانا لہ لحافظون۔ "ہم نے اس نصیحت کی کتاب کو نازل کیا ہے اور ہم ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں"۔

یہ ہے قرآن کی تعلیم۔ اس کے برعکس محترم مودودی صاحب فرماتے ہیں کہ نہیں رسول اللہؐ کو قرآن کے علاوہ اور بھی بہت کچھ وحی کے ذریعے ملتا تھا جو قرآن کے ساتھ بالکل قرآن کی مثل تھا اور اس کی اتباع بھی اسی طرح ضروری ہے جس طرح قرآن کی۔ اس دوسرے حصہ کا نام روایات ہیں۔ یعنی ان کے نزدیک وحیٔ خداوندی دو حصوں میں تقسیم ہو جاتی تھی۔ ایک حصہ قرآن کریم میں درج کر دیا جاتا تھا اور دوسرا حصہ روایات میں آجاتا تھا۔

آپ سارا قرآن چھان ماریئے۔ آپ کو کہیں یہ نہیں ملے گا کہ وحی کے دو حصے تھے، ایک قرآن اور ایک روایات۔ خود مودودی صاحب کی تحریروں میں بھی ہمیں ان کے اس عقیدہ کی تائید میں قرآن کی کوئی سند نہیں مل سکی۔ اس کا مدار خود ایک روایت[1] پر ہے، جس میں لکھا ہے کہ حضورؐ کو قرآن کے ساتھ، قرآن کی مثل (مثلہ معہ) اور کچھ بھی بذریعہ وحی ملا اور وہ روایات ہیں۔

یہ ظاہر ہے کہ قرآن کریم ایک مختصر سی کتاب ہے جو حضورؐ کی تیئس سالہ نبوت کی زندگی میں جزو جزو نازل ہوتا رہا۔ اس سے واضح ہے کہ نبی اکرمؐ پر ہر وقت وحی نازل نہیں ہوا کرتی تھی۔ خود روایات بتاتی ہیں کہ جب وحی نازل ہوتی تھی تو اس وقت حضورؐ پر ایک خاص کیفیت طاری ہوا کرتی تھی جو وحی کے ختم ہو جانے کے بعد باقی نہیں رہا کرتی تھی جب حضورؐ پر وحی نازل ہو چکتی تو آپ فرماتے کہ یہ سورت یا یہ آیت نازل ہوئی ہے۔ انھیں قرآن کے فلاں مقام پر رکھ لو۔ چنانچہ اس وحی کو کاتبانِ وحی سے لکھوا دیا جاتا اور حفاظ کو یاد کرا دیا جاتا۔ اس وحی کے بعد دن رات کے باقی حصہ میں حضورؐ جو کچھ ارشاد فرماتے، انھیں نہ کاتبانِ وحی سے لکھوایا جاتا، نہ حفاظ کو

---

[1] ہمیں محترم تمنا عمادی صاحب کی طرف سے ایک مبسوط مضمون موصول ہوا ہے، جس میں انھوں نے اپنے خاص انداز میں اس روایت پر تنقید کی ہے اور نہایت واضح دلائل سے بتایا ہے کہ یہ روایت کتنی بڑی سازش کا نتیجہ تھی اور اس کا سلسلہ اسناد کس قدر غیر معتبر ہے۔ ہم عند الضرورت اس مضمون کو شائع کریں گے۔

یاد کرایا جاتا۔ نہ حضورؐ کبھی یہ حکم دیتے کہ اسے قرآن کے فلاں مقام میں درج کرلو۔ اس سے ظاہر ہے کہ وحی اور حضورؐ کی باقی زندگی ایک دوسرے سے متمیز تھیں۔ وحی اللہ کی طرف سے نازل ہوتی تھی۔ اسی کا مجموعہ قرآن ہے۔ اسی پر ایمان لانے کا حکم تھا۔ یہی لکھی جاتی تھی۔ اسی کو حفظ یاد کرایا جاتا تھا۔ اسی کی اتباع خود رسول اللہؐ فرماتے تھے اور اسی کی اتباع اور مسلمانوں سے کراتے تھے۔ نہ اس میں کسی غلطی کا امکان تھا نہ سہو و فروگذاشت کی کوئی گنجائش۔ لیکن وحی کے علاوہ حضورؐ جو کچھ فرماتے تھے وہ منزل من اللہ نہیں ہوتا تھا بلکہ حضورؐ کی اپنی طرف سے ہوتا تھا۔ اگرچہ حضورؐ بصیرتِ ایمانی کے اس مقام بلند پر تھے جہاں کوئی اور نہ تھا اور آپ کی سیرتِ طیبہ مکارمِ اخلاق اور خلقِ عظیم کا مظہرِ اتم تھی۔ لیکن بشریت کے تقاضے بہرحال حضورؐ کے ساتھ تھے۔ حضورؐ کی زندگی کے ان دو حصوں کو خود قرآن کریم نے متمیز کرکے دکھا دیا ہے جب فرمایا کہ ان سے کہدو کہ انما انا بشر مثلکم یوحیٰ الی ۔ ۔ ۔ "میں تمہارے جیسا ایک انسان ہوں اس فرق کے ساتھ کہ مجھ پر وحی ہوتی ہے"۔ اور دوسری جگہ ہے کہ

قل ان ضللت فانما اضل علیٰ نفسی۔ وان اھتدیت فبما یوحیٰ الی ربی۔ (۳۴/۵۰)

ان سے کہو کہ اگر میں غلطی کروں تو اس کی ذمہ داری خود مجھ پر ہے۔ اور اگر میں ہدایت پر ہوں تو یہ اس قرآن کی بدولت ہے جو میرا رب میری طرف وحی کرتا ہے۔

لیکن مودودی صاحب فرماتے ہیں کہ نہیں! یہ بھی غلط ہے۔ نبی اکرمؐ زندگی کے ہر سانس میں رسول تھے۔ آپ کی ہر بات وحی ہوتی تھی۔ اس کا ایک حصہ قرآن میں درج کرادیا جاتا تھا اور دوسرا حصہ ویسے رہنے دیا جاتا تھا۔ یہ دوسرا حصہ کتب روایات میں ہے چنانچہ آپ فرماتے ہیں:

قرآن کریم میں آنحضرتؐ کی ایک ہی حیثیت بیان کی گئی ہے اور وہ رسول اور نبی ہونے کی حیثیت ہے۔ جس وقت اللہ تعالیٰ نے آپ کو منصب رسالت سے سرفراز کیا، اس وقت سے لیکر حیاتِ جسمانی کے آخری سانس تک، آپ ہر آن اور ہر حال میں خدا کے رسول تھے۔ آپ کا ہر فعل اور ہر قول رسولِ خدا کی حیثیت سے تھا۔ ۔ ۔ ۔ حتیٰ کہ آپ کی نجی اور خاندانی اور شہری زندگی کے سارے معاملات بھی اسی حیثیت کے تحت آگئے تھے۔ (تفہیمات حصہ اول ص۴۳)

اس کے بعد آیہ "وما ینطق عن الھویٰ" (جس کا ذکر اوپر آچکا ہے) کے حوالے سے فرماتے ہیں:

ہر وہ بات جس پر نطقِ رسول کا اطلاق کیا جاسکتا ہے آیات مذکورہ کی بنا پر وحی ہوگی اور ہوائے نفس سے پاک ہوگی۔ یہ تصریح قرآن میں اس لئے کی گئی ہے کہ رسول کو جن لوگوں کے پاس بھیجا گیا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ وہ جان لیں کہ رسول کی ہر بات خدا کی طرف سے ہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ میں کہتا ہوں کہ آنحضرتؐ جس وقت جس حالت میں جو کچھ بھی کرتے تھے رسول کی حیثیت سے کرتے تھے۔ (ایضاً ص۴۳-۲۴۲)

آگے چل کر لکھتے ہیں:

کتاب کے ساتھ رسول اللہؐ کو اسی غرض سے بھیجا گیا تھا کہ آپ اس ماہر فن استاد کی ضرورت کو پورا کریں۔ آپ نے استاد کی حیثیت سے جو کچھ بتایا اور سکھایا ہے وہ بھی اسی طرح خدا کی طرف سے ہے جس طرح قرآن خدا کی طرف سے ہے، اس کو "غیر از قرآن" کہنا صحیح نہیں۔ (ص ۲۳۶)

ان اقتباسات سے ظاہر ہے کہ مودودی صاحب کے نزدیک

(۱) نبی اکرمؐ نے بعثت کے بعد، جو بات جس وقت، جس حالت میں بھی فرمائی وہ بحیثیت رسول کے تھی۔

(۲) حضورؐ کی ہر بات اُسی طرح خدا کی طرف سے ہوتی تھی جس طرح قرآن خدا کی طرف سے ہے۔ اور

(۳) ان دونوں میں کوئی فرق نہیں۔ وہ باتیں "غیر از قرآن" ہیں ہی نہیں۔

ان تینوں مقدمات کو سامنے رکھ کر آگے بڑھئے۔ اس مقام پر یہ سوال پیدا ہوا کہ اگر حضورؐ کی ہر بات منجانب اللہ ہوتی تھی تو پھر یہ کیسے ہوا کہ حضورؐ کی کئی ایک باتوں پر اللہ تعالیٰ نے آپ کو ٹوکا۔ چنانچہ ان کا ذکر خود قرآن کریم میں ہے۔ مثلاً آپ نے ایک قسم کا شہد کھانے سے قسم کھائی تو ارشاد ہوا کہ

یایھا النبی لم تحرم ما احل اللہ لک (سورہ تحریم)

اے نبی! جس کو اللہ نے تمہارے لئے حلال قرار دیا ہے اسے تم کیوں حرام کرتے ہو؟

ظاہر ہے کہ اگر حضورؐ کا اپنے اوپر شہد کو حرام قرار دے لینا من جانب اللہ تھا تو خدا نے اس پر اعتراض کیوں کیا؟ یعنی پہلے خدا نے خود ہی رسول اللہؐ سے کہدیا کہ شہد کو اپنے اوپر حرام کرلو۔ اور جب آپ نے اس حکم کی تعمیل کرلی تو پھر خود ہی اس پر تادیب بھی نازل کردی؟ یا مثلاً دوسری جگہ ہے، عفا اللہ عنک لم اذنت لھم (توبہ) "اے نبی! خدا نے تمہیں معاف کردیا۔ تم نے انہیں اجازت کیوں دیدی تھی؟" اب ظاہر ہے کہ اگر حضورؐ کا اجازت دیدینا از روئے وحی تھا تو اس پر وحی بھیجنے والے خدا نے تہدید کیوں فرمائی! اسی طرح ایک اور واقعہ میں قرآن میں آیا ہے کہ "عبس وتولیٰ ان جاءہ الاعمیٰ" (سورۂ عبس) یعنی "اے رسول تمہیں یہ بات بہت ناگوار گزری کہ وہ اندھا اُس وقت تمہارے پاس کیوں آگیا۔ اس سے تمہاری پیشانی پر بل آگئے"۔ سو اگر حضورؐ کی پیشانی پر بل وحی کے مطابق آئے تھے تو پھر وحی نے اس پر تنبیہ کیوں کی؟

سنئے کہ اس کے جواب میں مودودی صاحب کیا فرماتے ہیں۔ لکھتے ہیں کہ

(رسول کے) معاملات کو اس کی بشری عقل اور اس کے انسانی اجتہاد پر نہیں چھوڑا گیا بلکہ جہاں خدا کے مقرر کئے خط مستقیم سے اس نے بال برابر بھی جنبش کی ہے وہیں اس کو ٹوک کر سیدھا کردیا گیا۔ (ص ۲۶۲)

آگے چل کر لکھتے ہیں:

منصبِ نبوت پر مامور ہونے کی وجہ سے نبی اکرمؐ کے لئے لازم ہے کہ اس کا اجتہاد بھی ٹھیک ٹھیک وحی الٰہی کے مطابق ہو۔ اگر وہ اپنے اجتہاد میں وحی خفی کے اشارے کو نہ سمجھ کر مرضیٔ الٰہی کے خلاف بال برابر بھی جنبش کرے تو اللہ تعالیٰ وحی جلی سے اس کی اصلاح کرنا ضروری سمجھتا ہے۔ (ص ۲۶۸)

پھر ارشاد ہے:

اگر رسول بمقتضائے بشریت کبھی اپنے اجتہاد میں بھی غلطی کرتے ہیں تو اللہ تعالیٰ فوراً ان کی اصلاح کر دیتا ہے۔ (ص ۲۶۹)

ان اقتباسات[1] سے ظاہر ہے کہ مودودی صاحب کے نزدیک

(۱) رسولؐ خود اجتہاد فرمایا کرتے تھے۔

(۲) بمقتضائے بشریت، اپنے اجتہاد میں غلطی بھی کر جاتے تھے۔

(۳) لیکن جہاں رسول اپنے اجتہاد میں غلطی کرتے تھے انہیں فوراً ٹوک دیا جاتا تھا۔

(۴) وحی کی دو قسمیں ہیں۔ وحی خفی اور وحی جلی۔ وحی خفی کے اشارات کو صحیح طور پر سمجھنے میں رسول سے سہو ہو جاتا تھا تو وحی جلی کے ذریعہ اس کی اصلاح کر دی جاتی تھی۔

اب اُن تین مقدمات کو سامنے لائیے جو پہلے گذر چکے ہیں اور ان کے مدمقابل مندرجہ بالا نتائج کو رکھئے اور پھر تضاد ملاحظہ فرمائیے۔

(۱) رسول اللہؐ کی ہر بات اسی طرح منجانب اللہ ہوتی تھی جس طرح قرآن منجانب اللہ تھا۔	(۱) رسول کے اجتہادات اپنی طرف سے ہوتے تھے جن میں غلطی بھی ہو جاتی تھی۔
(۲) رسول اللہؐ جس وقت جس حالت میں جو بات بھی کرتے تھے رسول کی حیثیت سے کرتے تھے۔	(۲) حضورؐ خدا کے متعین کردہ خط مستقیم سے جنبش کر جاتے تھے تو فوراً آپ کی اصلاح کر دی جاتی تھی۔
(۳) حضورؐ کے اجتہادات اور قرآن میں کوئی فرق نہیں۔	(۳) قرآن وحی جلی ہے اور باقی وحی خفی۔

یہ نکتہ ذرا باریک ہے۔ اسے غور سے سمجھئے۔ اگر رسول اللہؐ کی ہر ایک بات منجانب اللہ تھی، اسی طرح جس طرح قرآن منجانب اللہ تو پھر یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ حضورؐ اجتہادات میں غلطی کر جاتے تھے، یا "وحی خفی" کا اشارہ سمجھنے میں سہو ہو جاتا تھا۔ جب حضورؐ کی ہر بات، ہر عمل، ہر فیصلہ منجانب اللہ تھا تو پھر اس میں غلطی کیسی اور "وحی خفی" کا اشارہ سمجھنے اور نہ سمجھنے کا سوال کیا؟ لیکن مودودی صاحب کے ارشاد کے مطابق خدا اور رسول میں معاملہ یوں تھا کہ

---

[1] جو حضرات اس موضوع سے زیادہ دلچسپی رکھتے ہوں انہیں چاہئے کہ وہ "تفہیمات" کو خود دیکھ لیں، انہی اقتباسات پر اکتفا نہ کریں تاکہ وہ ان چیزوں کو اور وضاحت سے دیکھ سکیں۔

(۱) رسول کی ہر بات خدا کی طرف سے ہوتی تھی۔

(۲) لیکن جب خدا دیکھتا کہ رسول فلاں معاملہ میں غلطی کر گیا ہے تو فوراً اس کی اصلاح کر دیتا۔

اگر کسی کے سر میں ذرا بھی عقل سلیم ہے تو ہم پوچھنا چاہتے ہیں کہ اسے ان دو باتوں میں کوئی ربط دکھائی دیتا ہے؟

پھر اس کے بعد دریافت طلب امر یہ ہے کہ مودودی صاحب نے وحی کی جو دو قسمیں ارشاد فرمائی ہیں (وحی خفی اور وحی جلی) تو اس تقسیم کا کوئی ذکر قرآن میں بھی ہے؟ یا (معاذ اللہ) خود خدا بھی اپنی وحی کے متعلق نہیں جانتا تھا کہ اس کی دو قسمیں ہیں؟

اب آگے بڑھئے۔ آپ اوپر دیکھ چکے ہیں کہ مودودی صاحب کے عقیدہ کے مطابق، نبی اکرمؐ کی ہر بات وحی ہوتی تھی۔ لیکن وہ دوسری جگہ فرماتے ہیں کہ

> رسول کو درمیانی واسطہ اس لئے بنایا گیا ہے کہ وہ اصولی قانون کو اپنی اور اپنی امت کی عملی زندگی میں نافذ کر کے ایک نمونہ پیش کر دیں اور اپنی خداداد بصیرت سے ہمارے لئے وہ طریقے متعین کر دیں جن کے مطابق ہمیں اس اصولی قانون کو اپنی اجتماعی زندگی اور انفرادی برتاؤ میں نافذ کرنا چاہئے۔ (ص ۲۳۷)

یعنی دین کے اصول قرآن کریم میں تھے اور رسول اللہؐ نے ان قوانین کو اپنی خداداد بصیرت سے عملاً متشکل کر کے دکھایا۔ اوپر کہا گیا تھا کہ رسول اللہؐ نے یہ کام وحی کے ذریعے کیا تھا لیکن یہاں کہا گیا ہے کہ حضورؐ نے اسے اپنی خداداد بصیرت سے کیا تھا۔ اگر منجانب اللہ وحی اور خداداد بصیرت، دو الگ الگ چیزیں ہیں تو مودودی صاحب کا تضاد واضح ہے۔ لیکن اگر مودودی صاحب کے نزدیک منزل من اللہ وحی، بصیرت ہی کا دوسرا نام ہے تو یہ عقیدہ غور طلب ہے۔ بصیرت کم و بیش ہر انسان میں موجود ہوتی ہے۔ یعنی یہ خاصہ مافوق البشر نہیں۔ اگر یہ کہا جائے کہ نبی کی بصیرت دوسرے تمام انسانوں سے زیادہ ہوتی ہے تو یہ فرق کمیت (Quantity) کا ہوا، کیفیت (Quality) کا نہ ہوا۔ اس سے یہ لازم آئیگا کہ بصیرت اور وحی میں فرق (Quantitative) ہے، (Qualitative) نہیں۔ نوع کے اعتبار سے دونوں ایک ہی ہیں۔ یعنی وحی، بصیرت ہی کی بڑھی ہوئی شکل کا نام ہے۔ یہ تصور برگسان کے ہاں تو ضرور ملتا ہے لیکن قرآن کی رو سے ایسا تصور غلط ہے۔ قرآن وحی کو ایک الگ خاصہ قرار دیتا ہے جس میں رسول کے علاوہ کوئی دوسرا انسان شریک نہیں ہوتا۔ لہٰذا وحی اور بصیرت مستقلاً دو الگ الگ خاصے ہیں۔ سو اگر رسول کے اجتہادات بذریعہ وحی ہوتے ہیں تو ان میں رسول کی اپنی بصیرت کا کوئی دخل نہیں ہوتا اور اگر وہ رسولؐ کی بصیرت کا نتیجہ ہوتے ہیں تو وہ وحی نہیں ہوتے ــــ مودودی صاحب دوسری جگہ تحریر فرماتے ہیں:

> قرآن ۲۳ سال کی مدت میں مختلف مواقع پر مختلف حالات اور ضروریات کے مطابق تھوڑا تھوڑا کر کے نازل ہوا ہے۔
>
> اسی طرح احادیث میں حضورؐ کے وہ اقوال جمع کئے گئے ہیں جو ۲۳ سال کے طویل زمانہ میں آپ نے مختلف مواقع پر

مختلف حالات میں حسب ضرورت ارشاد فرمائے۔ (ص ۱۵۹)

لیجئے! یہاں قرآن اور احادیث کا فرق خود سامنے آگیا۔ قرآن ۲۳ سال کے عرصہ میں حضورؐ پر نازل ہوا تھا اور احادیث وہ اقوال ہیں جو رسول اللہؐ نے حسب ضرورت ارشاد فرمائے۔

لیکن آگے چل کر پھر اس کی تردید ہو جاتی ہے۔ فرماتے ہیں:

ان آیات میں جس چیز کو وحی کہا گیا ہے اس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اس سے مراد کتاب اللہ ہے اور کتاب کے سوا کوئی وحی نبی پر نازل نہیں ہوتی۔ لیکن یہ خیال قطعاً غلط ہے۔ قرآن مجید سے ثابت ہے کہ انبیاء کرامؑ پر صرف کتاب ہی نازل نہیں کی جاتی بلکہ ان کی ہدایت اور راہ نمائی کیلئے اللہ تعالیٰ ہمیشہ وحی نازل کرتا رہتا ہے اور اسی وحی کی روشنی میں وہ سیدھی راہ چلتے ہیں۔ (ص ۲۷۴)

پہلے لکھا تھا کہ "احادیث وہ اقوال ہیں جو رسول اللہؐ نے حسب ضرورت ارشاد فرمائے"۔ اب فرماتے ہیں کہ نہیں احادیث رسول اللہؐ کے اقوال نہیں ہیں بلکہ یہ بھی منجانب اللہ وحی ہیں۔

مودودی صاحب نے یہاں یہ بھی فرمایا ہے کہ "قرآن مجید سے ثابت ہے کہ انبیاء کرام پر صرف کتاب ہی نازل نہیں کی جاتی بلکہ ان کی ہدایت اور راہ نمائی کیلئے اللہ تعالیٰ ہمیشہ وحی نازل کرتا رہتا ہے"۔ لیکن آپ کو معلوم ہے کہ اس دعویٰ کی دلیل میں آپ نے قرآن سے کونسی سند پیش کی ہیں؟ سن لیجئے۔ آپ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت نوحؑ سے فرمایا کہ ہماری وحی کے مطابق کشتی تیار کرو۔ حضرت یوسفؑ کو خوابوں کی تعبیر بتائی جاتی ہے۔ حضرت موسیٰؑ سے طور پر باتیں کی جاتی ہیں جن میں آپ کی بکریوں اور لاٹھی کا تذکرہ بھی ہے۔ پھر حضرت موسیٰؑ کو فرعون کی طرف بھیجا جاتا ہے اور تمام ہدایات دی جاتی ہیں کہ وہ کس طرح بنی اسرائیل کو ساتھ لیکر نکل آئیں۔ ان واقعات کے تذکرہ کے بعد مودودی صاحب فرماتے ہیں:

کیا ان میں سے کوئی وحی بھی ایسی ہے جو کتاب کی صورت میں ہدایت عام کیلئے نازل ہوئی ہو؟ یہ مثالیں اس امر کے ثبوت میں کافی ہیں کہ انبیاءؑ کی طرف اللہ ہمیشہ متوجہ رہتا ہے اور ہر ایسے موقع پر جہاں بشری فکر و رائے کی غلطی کا امکان ہو اپنی وحی سے ان کی راہ نمائی کرتا رہتا ہے۔ اور یہ وحی اس وحی سے ماسوا ہوتی ہے جو ہدایت عام کیلئے ان کے واسطے سے بھیجی جاتی اور کتاب میں درج کی جاتی ہے تاکہ لوگوں کے لئے ایک الٰہی ہدایت نامہ اور دستور العمل کا کام دے۔ (ص ۲۷۵)

سب سے پہلے تو یہ امر دریافت طلب ہے کہ مودودی صاحب کے پاس اس بات کا کیا ثبوت ہے کہ یہ باتیں جن کا ذکر انھوں نے فرمایا ہے، ان انبیاء کرامؑ کی کتابوں میں درج نہیں تھیں۔ بیان کا محض قیاس ہے اور قیاس کی بنیاد یہ ہے کہ چونکہ یہ باتیں ان انبیاء کرام کی ذات سے

متعلق تھیں اور "ہدایتِ عام" کے لئے نازل نہیں ہوئی تھیں، اس لئے انھیں ان کی کتابوں میں درج نہیں ہونا چاہئے تھا۔ لیکن دیکھئے کہ قرآن کریم اس دلیل کی کس طرح تردید کر رہا ہے۔ کئی ایک واقعات ایسے تھے جن کا تعلق نبی اکرمؐ کی ذات سے تھا لیکن بایں ہمہ وہ قرآن میں درج ہیں۔ مثال کے طور پر حضورؐ کی ازواجِ مطہرات کے ضمن میں سورۂ احزاب کی وہ آیات ملاحظہ کیجئے جن میں ارشاد ہے کہ

اے نبی! ہم نے تیرے لئے وہ بیویاں جائز کر دیں جنھیں تو نے ان کے مہر دیئے ہیں اور جس کا تیرا دایاں ہاتھ مالک ہوا اس سے جو اللہ نے تجھ پر (کفار سے) لوٹایا۔ اور تیرے چچا کی بیٹیاں اور تیری پھوپھیوں کی بیٹیاں اور تیرے ماموں کی بیٹیاں اور تیری خالاؤں کی بیٹیاں جنھوں نے تیرے ساتھ ہجرت کی اور مومن عورت اگر وہ اپنے آپ کو نبی کو ہبہ کر دے اگر نبی اس سے نکاح کا ارادہ کرے۔ (۳۳/۵۰)

یہ احکام نبی اکرمؐ کی ذات سے متعلق تھے۔ ان کے اخیر میں قرآن نے تصریح کر دی تھی کہ خالصۃ لک من دون المؤمنین (۳۳/۵۰) "یہ صرف تیرے لئے حکم ہے، مومنین کے لئے نہیں"۔ غور کیجئے جس حکم کے متعلق خود اللہ نے تصریح کر دی ہے کہ وہ صرف نبی اکرمؐ کی ذات کے لئے تھا، مومنین کیلئے نہیں تھا، وہ بھی قرآن میں موجود ہے۔ پھر اس کے بعد کی آیات بھی دیکھئے جن میں مذکور ہے کہ "اس کے بعد تیرے لئے اور عورتیں نکاح میں لانا جائز نہیں اور نہ ہی موجودہ بیویوں کی جگہ دوسری بیویاں نکاح میں لانا" (۳۳/۵۲) یہ حکم بھی خاص رسول اللہؐ کے لئے تھا۔ اسی طرح سورۂ تحریم میں دیکھئے جہاں اللہ نے وہ واقعہ بھی درج قرآن کر دیا جس میں رسول اللہؐ کی ایک بیوی نے کوئی راز کی بات دوسری بیوی سے کہہ دی تھی اور اللہ نے ان سے کہا تھا کہ تمہیں توبہ کرنی چاہئے۔ ظاہر ہے کہ یہ واقعہ بھی خالص رسول اللہؐ کے ذاتی معاملات سے متعلق تھا، بایں ہمہ یہ بھی درجِ کتاب ہے۔ تہجد کے متعلق قرآن کریم نے خود ہی کہہ دیا کہ نافلۃ لک "یہ صرف (اے رسول) تیرے لئے اضافہ ہے، دوسروں کے لئے نہیں۔ یہ حکم جو صرف رسول اللہؐ کے لئے مختص تھا، قرآن میں درج ہے۔ لہٰذا مودودی صاحب کا بیان فرمودہ یہ اصول بھی غلط ہے کہ جو باتیں "عام ہدایت کے لئے نہیں ہوتی تھیں" وہ درجِ کتاب نہیں کی جاتی تھیں[1]۔ اگر یہ کہہ دیا جائے کہ ان باتوں سے عام ہدایت مقصد ہے تو پھر حضرت نوحؑ، حضرت یوسفؑ، اور حضرت موسیٰؑ کی جن باتوں کا ذکر مودودی صاحب نے فرمایا ہے، کیا ان سے عام ہدایت مقصود نہیں ہو سکتی؟ تعجب ہے کہ مودودی صاحب کے ارشاد کے مطابق وہ باتیں ان انبیاء کرامؑ کی کتابوں میں درج ہونے کے قابل تو تھیں کیونکہ ان سے ہدایت عامہ مقصود نہ تھی، لیکن انہی باتوں کو اللہ تعالیٰ نے قرآن میں درج کر دیا جو قیامت تک کے انسانوں کے لئے عام ہدایت کی کتاب ہے۔ ایسا تو ہو سکتا تھا کہ کوئی بات انبیائے سابقہ کی کسی کتاب میں ہوتی اور قرآن میں اسے درج نہ کیا جاتا کیونکہ وہ اُسی زمانہ کے لئے تھی۔ لیکن یہ واقعہ عجیب ہے کہ ایسی باتیں جو اُس زمانہ کے لوگوں کی ہدایت کیلئے تو نہ تھیں اس لئے ان انبیاء کرامؑ کی کتابوں میں درج نہ کی گئیں، انھیں ہزارہا سال بعد قرآن کریم

---

[1] واضح رہے کہ ہم اس وقت مودودی صاحب کے پیش کردہ اصول پر بحث کر رہے ہیں ورنہ ہمارے نزدیک ہر وہ چیز جو قرآن میں درج ہے نوعِ انسانی کے لئے باعثِ ہدایت ہے۔

میں درج کر دیا گیا؟ ہم یہ کچھ لکھ رہے ہیں اور ہمارا دل دکھ رہا ہے کہ ان لوگوں نے کس طرح قرآن کو کھیل بنا رکھا ہے!

لیکن ہم کہتے ہیں کہ مودودی صاحب کے اس بیان کے مطابق، سارا مسئلہ ہی حل ہو جاتا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ

یہ وحی اُس وحی سے ماسوا ہوتی ہے جو ہدایت عام کے لئے (انبیاء کی) وساطت سے بھیجی جاتی ہے اور کتاب میں درج کی جاتی ہے تاکہ لوگوں کے لئے ایک الٰہی ہدایت نامہ اور دستور العمل کا کام دے۔

اس سے ظاہر ہے کہ

(i) ایک وحی وہ ہوتی تھی جو ہدایت عام کے لئے نہیں ہوتی تھی۔ وہ صرف رسول کی اپنی ہدایت کے لئے ہوتی تھی۔ اس لئے کتاب میں درج نہیں کی جاتی تھی۔ اور

(ii) دوسری وحی، ہدایت عام کے لئے ہوتی تھی اور کتاب میں درج کی جاتی تھی تاکہ لوگوں کے لئے الٰہی ہدایت نامہ اور دستور العمل کا کام دے۔

پہلی قسم کی وحی جس کا تعلق نبی اکرمؐ کی ذات تک تھا، حضورؐ کی وفات سے ختم ہو گئی۔ اب نوعِ انسانی کے لئے الٰہی ہدایت نامہ اور دستور العمل دوسری قسم کی وحی ہے، جو قرآن کریم میں درج ہے۔ یہی ہم کہتے ہیں کہ نوعِ انسانی کے لئے ہدایت نامہ اور دستور العمل خدا کی کتاب ہے۔ یہ بحث کہ رسول اللہؐ اپنی ہدایت کے لئے اس سے الگ وحی ہوتی تھی یا نہیں، محض نظری ہے۔ ہم یہ کہتے ہیں کہ رسول اللہؐ کیلئے بھی الٰہی ہدایت نامہ اور دستور العمل یہی قرآن تھا کیونکہ قرآن میں بالتصریح حکم ہے کہ رسول اللہؐ اسی کا اتباع کریں اور اسی سے ہدایت حاصل کریں۔ لیکن اگر مودودی صاحب قرآن کے اس واضح ارشاد کے علی الرغم یہی ماننے پر اصرار کرتے ہیں کہ نہیں! قرآن ہماری ہدایت کے لئے ہے اور رسول اللہؐ کی ہدایت کیلئے ایک اور وحی ہوتی تھی، تو انہیں کون مجبور کر سکتا ہے کہ وہ ضرور قرآن ہی کا ارشاد مانیں؟ لیکن یہاں تک تو وہ بھی متفق ہیں کہ عام ہدایت کیلئے، الٰہی ہدایت نامہ اور دستور العمل وہی وحی ہے جو قرآن میں درج ہے۔ وہو المراد!

بہرحال، مودودی صاحب کو اصرار ہے کہ رسول اللہؐ کی ہر بات وحی ہوتی تھی اور وحی کی دو قسمیں ہوا کرتی تھیں۔ آیئے ذرا یہ دیکھیں کہ کیا صحابۂ کبارؓ کو بھی اس کا علم تھا کہ رسول اللہؐ کی ہر بات وحی پر مبنی ہوتی ہے اور وحی کی دو قسمیں ہیں یا وہ بھی اس راز درونِ پردہ سے (معاذ اللہ) بے بہرہ تھے۔ نہیں! اور آگے بڑھئے اور دیکھئے کہ کیا خود ذاتِ رسالتمآبؐ کو بھی اس حقیقت کا علم تھا کہ حضورؐ کی ہر بات وحی ہوتی ہے اور اس وحی کی دو قسمیں ہیں یا (معاذ اللہ۔ معاذ اللہ) آپؐ بھی اس سے بے خبر تھے!

مودودی صاحب کے اس دعوے کو پھر دہرایئے کہ رسول اللہؐ کی ہر بات وحی ہوتی تھی، حضورؐ کوئی بات اپنی طرف سے نہیں فرماتے تھے۔ جو کچھ کرتے تھے، وحی کے مطابق کرتے تھے۔ اس وحی میں سے ایک حصہ درج کتاب ہو جاتا تھا اور دوسرا حصہ ویسے رہنے

دیا جاتا تھا۔ اس کے بعد دو چار واقعات کو سامنے لائیے۔

جنگِ بدر کے موقعہ پر حضورؐ نے ایک خاص مقام کا انتخاب فرمایا۔ اس کے بعد

حضرت حباب بن منذر نے آنحضرتؐ کی خدمت میں عرض کی کہ جو مقام انتخاب کیا گیا ہے وحی کی رو سے ہے یا فوجی تدبیر ہے؟ ارشاد ہوا کہ وحی نہیں ہے۔ حباب نے کہا تو بہتر ہوگا کہ آگے بڑھ کر چشمہ پر قبضہ کر لیا جائے۔ آپ نے یہ رائے پسند فرمائی اور اس پر عمل کیا گیا۔ (سیرت النبیؐ، علامہ شبلی۔ حصہ اول ص۲۹۵)

مودودی صاحب کے ارشاد کے مطابق (کہ حضورؐ کی ہر بات وحی ہوتی تھی) حضورؐ کا انتخاب مقام وحی کی رو سے تھا۔ لیکن حضرت حبابؓ دریافت فرماتے ہیں کہ آیا یہ انتخاب وحی کی رو سے ہے یا فوجی تدبیر کے مطابق۔ اس سے ظاہر ہے کہ حضرت حبابؓ کو اس کا علم نہیں تھا کہ حضورؐ کی ہر بات وحی ہوتی ہے۔ اس پر رسول اللہؐ فرماتے ہیں کہ نہیں، یہ وحی کی رُو سے نہیں ہے۔ اب دو ہی صورتیں ہو سکتی ہیں:

(۱) یا تو (معاذ اللہ) رسول اللہؐ کو بھی وہ بات معلوم نہ تھی جو مودودی صاحب کو معلوم ہے۔ اور

(۲) اگر رسول اللہؐ نے سچ فرمایا ہے (اور کون بدبخت ہے جو رسول اللہؐ کے متعلق بھی یہ گمان کرے کہ (پناہ بخدا) حضورؐ نے سچ نہیں فرمایا تھا) تو پھر جو کچھ مودودی صاحب فرما رہے ہیں اس کے متعلق خود ہی اندازہ فرما لیجئے کہ وہ کیا ہوا؟

اور دیکھئے۔ جنگ بدر کے قیدیوں کے متعلق

آنحضرتؐ نے مدینہ میں آکر مشورہ کیا کہ ان کے معاملہ میں کیا کیا جائے۔ حضرت ابوبکرؓ نے عرض کیا کہ سب اپنے ہی عزیز و اقارب ہیں، فدیہ لیکر چھوڑ دیئے جائیں۔ لیکن حضرت عمرؓ کے نزدیک اسلام کے مسئلہ میں دوست، دشمن، عزیز و بیگانہ، قریب و بعید کی تمیز نہ تھی۔ اس لئے انھوں نے یہ رائے دی کہ سب قتل کر دیئے جائیں اور ہم میں سے ہر شخص اپنے عزیز کو قتل کر دے۔ آنحضرتؐ نے صدیق اکبرؓ کی رائے پسند کی اور فدیہ لیکر چھوڑ دیا۔ اس پر خدا کا عتاب آیا اور یہ آیت اتری۔ لولا کتاب من اللہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ (اگر خدا کا نوشتہ پہلے نہ لکھا جا چکا ہوتا تو جو کچھ تم نے لیا اس پر بڑا عذاب نازل ہوتا) آنحضرتؐ اور حضرت ابوبکرؓ یہ عتاب ربانی سُن کر رو پڑے۔[1] (ایضاً ص۳۰۷)

اب دیکھئے کہ مودودی صاحب کے ارشاد کے مطابق، بات کیا ہوئی۔

(۱) جنگ کے قیدیوں کے متعلق حضورؐ نے صحابہؓ سے مشورہ کیا۔ [اگر رسولؐ کی ہر بات وحی کی رو سے ہوتی تھی تو حضورؐ کو مشورہ کرنے کی کیا ضرورت تھی؟]

---

[1] علامہ شبلی نے یہ بھی لکھا ہے کہ یہ عتاب مالِ غنیمت کی تقسیم کے متعلق تھا۔ لیکن یہ چیز تو اپنی جگہ پر موجود رہتی ہے کہ حضورؐ کے ایک فیصلہ پر اللہ کی طرف سے ایسا عتاب نازل ہوا کہ حضورؐ رونے لگے۔

(ii) حضورؐ نے مشورہ کے بعد حضرت ابوبکرؓ کی رائے پسند فرمائی اور اسی کے مطابق عمل کیا۔ ظاہر ہے کہ (مودودی صاحب کے بیان کے مطابق) حضورؐ کا یہ عمل وحی کی رو سے تھا۔

(iii) اس پر خدا نے عتاب نازل فرمایا۔ یعنی پہلے تو خود ہی خدا نے وحی کے ذریعے یہ کہدیا کہ حضرت ابوبکرؓ کی رائے اختیار کرلو اور جب آپ نے وہ رائے اختیار کرلی تو پھر آپ پر عتاب نازل کردیا۔ (معاذ اللہ۔ معاذ اللہ)

افک حضرت عائشہؓ کا واقعہ مشہور ہے۔ منافقین کی بہتان طرازی کے بعد آپ نے حضرت عائشہ صدیقہؓ کی درخواست پر انھیں اُن کے میکے بھیجدیا اور خود وحی کا انتظار فرماتے رہے۔ اس دوران میں حضورؐ نے لوگوں سے مشورہ بھی کیا۔ چنانچہ قریب ایک ماہ کے بعد جب وحی نے حضرت صدیقہؓ کی پاکدامنی کی تصدیق کردی تو حضورؐ نے انھیں بشارت دی۔ یعنی مودودی صاحب کے ارشاد کے مطابق پہلے اللہ تعالیٰ نے وحی خفی کے ذریعے یہ کہدیا کہ حضرت عائشہؓ کو ان کے میکے جانے کی اجازت دیدی جائے۔ پھر لوگوں سے مشورہ کرنے کا حکم بھی وحی خفی کے ذریعے سے دیا۔ اس کے بعد وحی جلی سے اعلان کردیا کہ حضرت عائشہؓ پاکدامن ہیں!

ناطقہ سر بگریباں کہ اسے کیا کہیئے!

اور سنئے! عرب ایک خاص موسم میں کھجور کے درختوں میں گابھا لگایا کرتے تھے۔ حضورؐ نے ایک مرتبہ فرمایا کہ یوں نہ کرو، یوں کرو۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس سال کھجوروں میں پھل نہ آیا، یا بہت کم آیا۔ یعنی یہ تجربہ ناکام رہا۔ اس پر رسول اللہؐ نے فرمایا کہ

میں نے صرف ایسا گمان کیا تھا۔ تخمینی بات کا مجھ سے مواخذہ نہ کرو۔ لیکن جب میں خدا کی جانب سے کوئی بات بیان کروں تو اس کو اختیار کرو۔ (حجۃ اللہ البالغہ)

یعنی مودودی صاحب فرماتے ہیں کہ حضورؐ کی ہر بات وحی کی رو سے ہوتی تھی اور رسول اللہؐ فرماتے ہیں کہ بعض باتیں میں اپنے گمان کی رُو سے کہتا ہوں اور بعض خدا کی جانب سے، تو جو باتیں میں اپنے ظن و تخمین کی بنا پر کہتا ہوں وہ غلط بھی ہوسکتی ہیں۔ انھیں اختیار نہ کیا کرو۔ بلکہ یہاں تک بھی کہ انتم اعلم بامور دنیاکم۔ دنیاوی معاملات تم مجھ سے بہتر جانتے ہو۔

اور دیکھئے! مقدمات کا فیصلہ، رسول اللہؐ کے اہم فرائض میں سے تھا۔ اگر رسول اللہؐ کی ہر بات وحی کی رو سے ہوتی تھی تو ظاہر ہے کہ ہر مقدمہ کا فیصلہ جو رسول اللہؐ فرماتے تھے، وحی کی رو سے ہوتا تھا، فلہذہ جھوٹ اور سچ نکھر کر الگ الگ ہوجاتا تھا۔ لیکن سنئے کہ خود رسول اللہؐ اس باب میں کیا فرماتے ہیں:

حضورؐ نے فرمایا کہ میرے پاس اہل مقدمہ آتے ہیں اور ممکن ہے کہ بعض آدمی بہ نسبت دوسروں کے زیادہ چرب زبان ہوں۔ چونکہ میں بھی انسان ہوں اس لئے شاید میں اس کو سچا جاننے لگوں اور اس کے موافق فیصلہ دیدوں۔ لہذا اگر میں کسی مسلمان کے حق میں ڈگری دیدوں تو اس کو آگ کا ٹکڑا سمجھنا چاہیئے۔ چاہے لے، چاہے چھوڑ دے۔ (بخاری۔ کتاب المظالم)

رسول اللہؐ اپنے متعلق یہ فرماتے ہیں اور مودودی صاحب کا ارشاد ہے کہ نہیں! حضورؐ کے تمام فیصلے وحی کی رو سے ہوا کرتے تھے!

یا مثلاً حضرت زیدؓ کا واقعہ دیکھئے جس کا ذکر قرآن کریم میں بھی ہے۔ نبی اکرمؐ حضرت زیدؓ سے فرماتے ہیں کہ امسک علیک زوجک۔ اپنی بیوی کو طلاق مت دو۔ اس پر حضرت زیدؓ دریافت فرماتے ہیں کہ یہ حکم وحی کا ہے یا آپؐ کا ذاتی۔ آپ نے فرمایا کہ یہ وحی کا حکم نہیں۔ حضرت زیدؓ نے اس حکم کے باوجود اپنی بیوی (حضرت زینبؓ) کو طلاق دیدی اور اس سے نہ خدا ناراض ہوا نہ خدا کا رسولؐ ورنہ ظاہر ہے کہ وحی کے حکم کی اس طرح کھلی ہوئی مخالفت کا نتیجہ کیا ہوتا ہے؟

یا اذان کا واقعہ لیجئے۔ صلوٰۃ کے لئے "منادی" کا ذکر قرآن میں موجود ہے۔ لیکن اس کی تصریح نہیں کہ یہ منادی کس انداز کی ہوگی۔ مروجہ اذان کس انداز سے اختیار کی گئی؟ رسول اللہؐ نے صحابہؓ سے مشورہ کیا۔ کسی نے کچھ مشورہ دیا کسی نے کچھ۔

آنحضرتؐ نے کسی مشورہ کو پسند نہ فرمایا۔ دوسرے دن حضرت عمر فاروقؓ نے آکر عرض کیا کہ انھوں نے خواب میں ان الفاظ کو سنا ہے جو اب اذان میں کہے جاتے ہیں۔ نبی اکرمؐ نے انہی الفاظ کو بآواز بلند پکارنے کو فرما دیا۔

(رحمۃ اللعالمین۔ حصہ اول ص۳۱۴)

غور فرمائیے، اذان کا معاملہ کوئی "نجی" معاملہ نہیں بلکہ خالص دین کا معاملہ ہے۔ اس کے لئے "وحی خفی" کچھ نہیں بتاتی۔ نبی اکرمؐ صحابہؓ سے مشورہ فرماتے ہیں۔ پہلے روز کوئی موزوں بات سامنے نہیں آتی تو معاملہ کو ملتوی کر دیا جاتا ہے۔ پھر دوسرے روز حضرت عمرؓ کی رائے کو اختیار کر لیا جاتا ہے۔ اس کے باوجود مودودی صاحب کا ارشاد ہے کہ رسول اللہؐ کی ہر بات وحی کی رو سے ہوتی تھی۔

یہ سوال کہ اگر رسول اللہ کی ہر بات وحی سے ہوتی تھی تو آپؐ صحابہؓ سے مشورہ کیوں کیا کرتے تھے، بڑا اہم ہے۔ واضح رہے کہ یہ مشورہ محض آپ کی مرضی پر منحصر نہ تھا بلکہ خدا نے حکم دیا تھا کہ وشاورھم فی الامر۔ "معاملات میں ان سے مشورہ کیا کرو" یعنی اللہ تعالیٰ رسول اللہؐ کو حکم دیتے ہیں کہ معاملات باہمی مشاورت سے طے کیا کرو۔ رسول اللہؐ اس حکم کے مطابق صحابہؓ سے برابر مشورہ فرماتے رہے ہیں اس سے صاف ظاہر ہے کہ ان باتوں میں نہ خدا کی طرف سے وحی ہوتی تھی نہ رسول اللہؐ اپنی بات کو وحی سمجھتے تھے۔ اس لئے کہ اگر رسولؐ کی ہر بات وحی ہوتی تو پھر مشورہ کے کیا معنی؟ لیکن دیکھئے مودودی صاحب اس باب میں کیا ارشاد فرماتے ہیں۔ لکھتے ہیں:

بلاشبہ رسول اللہؐ کو لوگوں سے مشورہ کرنے کا حکم دیا گیا تھا مگر وہ اس لئے تھا کہ آپ اپنی امت کے لئے مشاورت کا نمونہ پیش کریں اور خود اپنے عمل سے جمہوریت کے صحیح اصول کی طرف راہ نمائی کریں۔ اس سے یہ نتیجہ نکالنا درست نہیں کہ آپ کی حیثیت دوسرے امراء کی سی ہے۔ دوسرے امراء کے لئے تو یہ قانون مقرر کیا گیا ہے کہ وہ مشورہ سے کام کریں۔ وامرھم شوریٰ بینھم۔ اور یہ کہ اگر اہل شوریٰ میں نزاع ہو تو وہ خدا اور رسولؐ کی طرف

رجوع کریں۔ فان تنازعتم فی شئ فردوہ الی اللہ والرسول۔ لیکن رسول اللہؐ کو جہاں مشورہ لینے کا حکم دیا گیا ہے وہیں یہ بھی کہدیا گیا ہے کہ جب آپ کسی بات کا عزم فرمالیں تو پھر خدا پر بھروسہ کرکے عمل کا اقدام فرمائیے۔ فاذا عزمت فتوکل علی اللہ۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ آپ مشورہ کے محتاج نہ تھے بلکہ آپ کو مشورہ کا حکم صرف اس لئے دیا گیا تھا کہ آپ کے مبارک ہاتھوں سے ایک صحیح جمہوری طرز حکومت کی بنیاد پڑجائے۔ (ایضاً ص۲۹۵)

سردست ان تمام مباحث کو الگ رکھ دیجئے کہ آپ کی اور دیگر امراء کی حیثیت میں کیا فرق تھا۔ فان تنازعتم فی شئ فردوہ الی اللہ والرسول کا صحیح مفہوم کیا ہے۔ فاذا عزمت فتوکل علی اللہ سے کیا مراد ہے (طلوع اسلام میں ان عنوانات پر اکثر و بیشتر گفتگو ہوتی رہتی ہے۔) اس وقت صرف اس توجیہ کو لیجئے جو مودودی صاحب کی طرف سے پیش کی گئی ہے۔ یہ واضح ہے کہ

(i) اللہ تعالیٰ نے رسولؐ کو حکم دیا کہ معاملات میں مسلمانوں سے مشورہ کیا کرو۔

(ii) رسول اللہؐ معاملات میں مسلمانوں سے مشورہ فرماتے رہے۔

(iii) ان مشوروں پر عمل ہوتا رہا۔

(iv) بعض باتیں جو مشورہ کی رو سے اختیار کی گئیں، اللہ کی منشا کے مطابق نہ نکلیں اس لئے خدا کی وحی نے ان پر تنبیہ کی۔

لیکن مودودی صاحب کا ارشاد ہے کہ حضورؐ مشاورت کے محتاج نہ تھے۔ یہ حکم محض اس لئے دیا گیا تھا کہ آپ کے ہاتھوں جمہوریت کی بنیاد رکھ دی جائے۔ سوال یہ نہیں کہ آپؐ مشورہ کے محتاج تھے یا نہیں تھے۔ سوال یہ ہے کہ آپ کو مشورہ کا حکم دیا گیا تھا یا نہیں۔ آپ مشورہ کیا کرتے تھے یا نہیں۔ اگر ان باتوں کا جواب اثبات میں ہے تو پھر اس الجھن کا کیا حل ہے کہ رسول اللہؐ کی ہر بات وحی ہوتی تھی لیکن آپؐ کیا وہ کرتے تھے جو مشورہ سے طے پاتا تھا۔ ان دونوں باتوں میں کوئی ربط، کوئی تعلق کوئی واسطہ بھی ہے؟ غالباً مودودی صاحب کا مطلب یہ ہے کہ آپ مشورہ کے تو محتاج نہ تھے لیکن (معاذ اللہ) محض دکھانے کیلئے مشورہ فرمایا کرتے تھے تاکہ امت میں طرز جمہوری کی بنیاد آپؐ کے مبارک ہاتھوں سے پڑجائے۔ لیکن پھر وہی دشواری سامنے آجائے گی کہ

(i) اگر آپؐ (معاذ اللہ) محض دکھانے کے لئے مشورہ فرمایا کرتے تھے (تاکہ جمہوریت کی بنیاد رکھ دی جائے) تو پھر ایسا مشورہ قبول کیوں فرماتے تھے جس پر وحی کی رو سے تنبیہ بھی آجاتی تھی۔ اور

(ii) اگر آپ صحیح معنوں میں مشورہ فرماتے تھے اور مشورہ قبول بھی کرتے تھے حالانکہ بعض اوقات وہ مشورہ منشاء خداوندی کے خلاف بھی ہوتا تھا، تو پھر یہ دعویٰ کس طرح صحیح ہوگا کہ آپ کی ہر بات وحی ہوتی تھی؟

آپ نے غور فرمایا کہ مودودی صاحب کی یہ توجیہ نہ صرف یہ کہ کس قدر بے معنیٰ ہے بلکہ یہ بھی کہ اس سے خود خدا اور اس کے رسولؐ کے

متعلق کیا تصور ذہن میں قائم ہوتا ہے؟

بہرحال مودودی صاحب کا ارشاد یہ ہے کہ

(i) ایک قسم کی وحی سے اللہ تعالیٰ دین کے اصولی احکام نازل کیا کرتا تھا اور یہ وحی کتاب میں درج ہو جاتی تھی۔ اور

(ii) اس کے بعد دوسری قسم کی وحی سے ان احکام کی تفاصیل نازل کیا کرتا تھا۔ لیکن یہ وحی کتاب میں درج نہیں ہوتی تھی اگرچہ یہ بالکل قرآن کے ہم پایہ اور اس کے مثل ہوتی تھی۔

(iii) یہ سب کچھ، یعنی تدوین جزئیات، وحی کی رو سے، بہ حیثیت رسالت ہوتا تھا۔ اور چونکہ رسول کی اطاعت شرط اسلام ہے اس لئے ان تمام امور کی اطاعت مسلمانوں پر فرض ہے۔

یہاں لامحالہ یہ سوال پیدا ہوتا تھا کہ اللہ تعالیٰ کو کیا ضرورت لاحق ہوئی کہ اس نے اپنی وحی کو اس طرح دو حصوں میں تقسیم کر دیا۔ جب دونوں چیزیں (اصول اور ان کی تفاصیل) منجانب اللہ تھیں، ایک ہی رسول پر نازل ہوتی تھیں، اور دین ان دونوں کے مجموعہ کا نام تھا۔ دونوں کو قیامت تک کے لئے غیر متبدل رہنا تھا۔ تو انہیں ایک ہی جگہ (قرآن میں) کیوں نہ رکھا گیا؟ مودودی صاحب فرماتے ہیں کہ تم نہیں جانتے کہ اس میں اللہ تعالیٰ کی کتنی بڑی مصلحت پوشیدہ تھی۔ سنو!

آپ پوچھتے ہیں کہ تفصیلاتِ نماز وغیرہ جو غیر از قرآن ہیں کیوں فریضۂ اولیں قرار دی جائیں۔ اس کا جواب یہ ہے کہ رسول اللہ کی بتائی ہوئی تفصیلاتِ نماز وغیرہ کو غیر از قرآن کہنا ہی سرے سے غلط ہے۔ اگر کوئی ماہر فن طبیب، فنِ طب کے کسی قاعدہ کو عملی تجربہ کر کے شاگردوں کو سمجھائے تو آپ اسے خارج از فن نہیں کہہ سکتے۔ اگر کوئی پروفیسر اقلیدس کے کسی مسئلہ کو شکلیں کھینچکر تشریح و تفصیل کے ساتھ سمجھائے تو آپ اسے غیر از اقلیدس نہیں کہہ سکتے[1]۔ ہر علم و فن کی اصولی کتابوں میں صرف اصول اور مہمات مسائل بیان کر دیئے جاتے ہیں اور عملی تفصیلات استاد[2] کے لئے چھوڑ دی جاتی ہیں، کیونکہ استاد عملی مظاہرہ سے جس بات کو چند لمحوں میں بتا سکتا ہے اسی کو اگر الفاظ میں بیان کیا جائے تو صفحے کے صفحے سیاہ ہو جائیں اور پھر بھی شاگردوں کے لئے لفظی بیان کے مطابق ٹھیک ٹھیک عمل کرنا مشکل ہو جائے۔ پھر کتاب کے حسنِ کلام اور اس کے کمالِ ایجاز کا غارت ہو جانا مزید برآں۔ یہ حکیمانہ قاعدہ جس کو معمولی انسان تک اپنے علوم و فنون کی تعلیم میں ملحوظ رکھتے ہیں آپ کی خواہش ہے کہ وہ سب سے بڑا حکیم جس نے قرآن نازل کیا ہے اس کو نظر انداز کر دیتا۔ آپ چاہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنی کتاب میں

---

[1] لیکن آپ اسے اقلیدس کی تصنیف بھی قرار نہیں دے سکتے۔ اقلیدس کی طرف سے وہی ہے جو اس نے اپنی کتاب میں درج کر دیا ہے۔

[2] بایں ہمہ، مصنف، مصنف رہتا ہے اور استاد، استاد۔

نماز کے اوقات کا نقشہ بتاتا۔ رکعتوں کی تفصیل بتاتا۔ رکوع و سجود و قیام کی صورتیں تفصیل کے ساتھ بیان کرتا۔ بلکہ نماز کی رائج الوقت کتابوں کی طرح ہر صورت کی تصویر بھی مقابل کے صفحات پر بنا دیتا۔ پھر تکبیر تحریمہ سے لیکر سلام تک نماز میں جو کچھ پڑھا جاتا وہ بھی لکھتا اور اس کے بعد وہ مختلف جزئی مسائل تحریر کرتا جن کے معلوم کرنے کی ہر نمازی کو ضرورت ہے۔ اس طرح قرآن کے کم از کم دو تین پارے صرف نماز کے لئے مخصوص ہو جاتے۔ پھر اسی طور پر دو دو تین تین پارے روزہ، حج اور زکوٰۃ کے تفصیلی مسائل پر بھی مشتمل ہوتے۔ اس کے ساتھ شریعت کے دوسرے معاملات بھی جو قریب قریب زندگی کے تمام شعبوں پر حاوی ہیں جزئیات کی پوری تفصیل کے ساتھ درج کتاب کر دیئے جاتے۔ اگر ایسا ہوتا تو بلاشبہ آپ کی یہ خواہش تو پوری ہو جاتی کہ شریعت کا کوئی مسئلہ غیر از قرآن نہ ہوتا۔ لیکن اس سے قرآن مجید کم از کم انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا کے برابر ضخیم ہو جاتا اور وہ تمام فوائد باطل ہو جاتے جو اس کتاب کو محض ایک مختصر سی اصولی کتاب رکھنے سے حاصل ہوئے ہیں۔ (ص ۳۳۳-۳۳۶)

غور فرمایا آپ نے اللہ تعالیٰ کی اس "حکمتِ بالغہ" پر جس کی رو سے اس نے اپنی وحی کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا اور مسلمانوں کو اس بوجھ سے بچا لیا جو اس تمام وحی کو ایک جلد (One Volume) میں منضبط کرنے سے انہیں اٹھانا پڑتا! مودودی صاحب کے ارشاد کے مطابق مسلمانوں کو اللہ کا ہزار ہزار شکر ادا کرنا چاہیئے کہ اس نے اپنی ساری وحی کو ایک ہی جلد میں درج نہیں کر دیا ورنہ یہ ضعیف و ناتوان بندے اس کے بوجھ سے دب کر مر جاتے!

جی تو چاہتا ہے کہ مودودی صاحب کی بیان کردہ "حکمتِ بالغہ" کے متعلق ذرا تفصیل سے گفتگو کی جائے لیکن عدم گنجائش تفصیل و اطناب سے مانع ہے اس لئے اختصار پر قناعت کی جاتی ہے۔ قرآن میں (مثلاً) جتنی مرتبہ صلوٰۃ کی تائید کی گئی ہے اگر ان تمام مقامات کو یکجا کیا جائے تو وہ ایک پارہ کے حجم سے کم نہ ہوں گے۔ اس تاکید کے لئے تو اللہ تعالیٰ نے ضخامت کا خیال نہ کیا لیکن اس کی جزئیات کو اس لئے چھوڑ دیا کہ اس سے ضخامت بڑھ جانے کا ڈر تھا۔ پھر یہ بھی دیکھئے کہ اللہ تعالیٰ نے صلوٰۃ کی جزئیات تو بیان نہ فرمائیں لیکن وضو کی تفصیل درج کتاب کر دی۔ اسی طرح زکوٰۃ کے متعلق دیکھئے۔ تاکیدی احکام کو اکٹھا کیجئے تو ایک اچھی خاصی سورت سے کم نہ ہوں گے لیکن سارے قرآن میں اس کے نصاب کا ذکر تک نہیں۔ ان کے برعکس، نکاح، طلاق، عدت وغیرہ کے احکام دیکھئے تو چھوٹی چھوٹی سی تفاصیل بھی قرآن میں مذکور ہیں۔ حتیٰ کہ بچے کو دودھ پلانے کی مدت تک بھی۔ معاشرتی احکام کو دیکھئے تو اس قسم کے امور کی تفاصیل بھی موجود ہیں کہ گھروں میں کس طرح آنا چاہیئے۔ کس کس کے ہاں سے کھانا چاہیئے۔ باہر والوں کو آواز کس طرح دینی چاہیئے۔ اندر سے چیزیں کس طرح مانگنی چاہئیں۔ مجلس میں کس طرح بیٹھنا چاہیئے۔ کس کے ہاں کھانا کھا کر جلدی اٹھ آنا چاہیئے۔ وغیرہ وغیرہ۔ لیکن اس کے برعکس ایسے ایسے اہم معاملات کی تفاصیل کہیں نہیں دی گئیں کہ امیر امت کا انتخاب کس طرح ہونا چاہیئے۔ مشاورت کا طریق کیا ہونا چاہیئے۔ حکومت کی شکل کس انداز کی

ہونی چاہئے۔ اور دیکھئے۔ قرآن میں زنا اور سرقہ کی سزاؤں کا ذکر موجود ہے لیکن شراب کی سزا کہیں متعین نہیں کی گئی! سوچئے کہ اس سے قرآن کی ضخامت پر کیا اثر پڑ جاتا؟ یا مثلاً قرآن میں ہے کہ ہر شخص اپنے مال میں وصیت کر سکتا ہے لیکن احادیث کی رو سے یہ وصیت صرف تہائی حصہ میں ہو سکتی ہے۔ مودودی صاحب کے ارشاد کی رو سے اگر تہائی حصہ کے الفاظ قرآن میں درج کر دیئے جاتے تو اس کی ضخامت بڑھ جاتی۔ یا مثلاً قرآن میں زانی اور زانیہ کی سزا سو سو کوڑے ہیں لیکن حدیث میں ہے کہ شادی شدہ زانی اور زانیہ کی سزا سنگسار ہے۔ سوچئے کہ اتنے الفاظ کے اضافے سے قرآن کا حجم کس قدر بڑھ جاتا! مودودی صاحب احکام کی تفصیل سے گھبراتے ہیں لیکن قرآن کے ایجاز کا تو اعجاز یہ ہے کہ اس نے وراثت کے احکام چار آیات میں درج کر دیئے ہیں اور اس جامعیت کے ساتھ کہ وراثت کے متعلق کوئی تفصیل ایسی نہیں جو ان چار آیتوں میں سمٹ کر نہ آ گئی ہو۔ لیکن انہی چار آیتوں کی تفصیل جب روایات کی رو سے ہوئی تو سب سے پہلے یہ کہا گیا کہ اللہ تعالیٰ کو (معاذ اللہ) چوتھی جماعت کے طالب علم جتنا حساب بھی نہیں آتا۔

ہم نے بغرض اختصار یہ چند مثالیں اس ضمن میں پیش کر دی ہیں کہ مودودی صاحب کی یہ توجیہ کہ ان تفصیلِ احکام کو اس لئے درجِ قرآن نہیں کیا گیا کہ اس سے ضخامت بڑھ جانے کا اندیشہ تھا کسقدر طفلانہ ہے۔ پھر یہ بات بھی سمجھ میں نہیں آتی کہ جب قرآن اور حدیث دونوں وحی ہیں تو پھر قرآن کو مختصر رکھنے سے فائدہ کیا ہوا جب اس کا دوسرا حصہ (احادیث) اسقدر ضخیم ہو گیا؟

مودودی صاحب کی توجیہ کا دوسرا حصہ یہ ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ تمام تفاصیل بھی درج قرآن کر دیتا تو "وہ تمام فوائد باطل ہو جاتے جو اس کتاب کو محض ایک مختصر سی اصولی کتاب رکھنے سے حاصل ہوئے ہیں"۔ یہی ہم کہتے ہیں کہ جب آپ لوگوں نے قرآن کے اصولی احکام کی تمام تفاصیل کو بھی منزل من اللہ (وحی) قرار دیدیا تو اس سے "وہ تمام فوائد باطل ہو گئے جو اس کتاب کو محض ایک مختصر سی اصولی کتاب رکھنے سے حاصل ہوتے تھے"۔ وہ فوائد یہی تھے کہ قرآن، اصولی کتاب تھا جس کی فروعات زمانہ کے ساتھ ساتھ ضروریات کے مطابق بدلتی رہتی تھیں۔ جب آپ نے ان فروعات کو بھی وحی قرار دیکر قیامت تک کیلئے غیر متبدل ٹھہرا دیا تو قرآن کو کتابِ اصول رکھنے کے تمام فوائد باطل ہو گئے۔ لیکن مودودی صاحب کی منطق ملاحظہ ہو کہ اگر وحی (جلد اول) اور وحی (جلد دوم) کو الگ الگ دو جلدوں میں رکھا جائے تو تمام فوائد برقرار رہ جاتے ہیں۔ لیکن اگر ان دونوں جلدوں کو یکجا کر دیا جاتا تو یہ تمام فوائد باطل ہو جاتے۔

نسوختت عقل زحیرت کہ ایں چہ بوالعجبی است!

واضح رہے کہ مودودی صاحب کے ارشاد کے مطابق، قرآن کے اصول اور رسول اللہؐ کی بیان فرمودہ تفاصیل دونوں منزل من اللہ (وحی) ہیں۔ لہٰذا ان دونوں کو الگ الگ رکھنا ایسا ہی ہے جیسے ضخامت بڑھ جانے کے خوف سے ایک کتاب کو دو جلدوں (Volumes) میں شائع کر دیا جائے۔ ایک جلد میں اصول ہیں اور دوسری جلد میں ان اصولوں کی تفصیلات۔ دونوں منزل من اللہ۔

یا مودودی صاحب کے الفاظ میں، ایک تصنیف ہے اور دوسری اس تصنیف کی استادانہ شرح لیکن یہ شرح بھی منجانب اللہ ہے — عدم گنجائش پھر مانع ہے کہ ہم شرح و بسط سے بتا سکیں کہ اس تصنیف اور اس کی شرح میں کس قدر باہمی تضاد ہے۔ سردست چند ایک مثالوں پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے۔ تصنیف (قرآن کریم) میں ہے کہ زانی مرد اور زانی عورت میں سے ہر ایک کو سو سو کوڑے بطور سزا لگاؤ۔ لیکن اس کی شرح (حدیث) کہتی ہے کہ نہیں۔ زانی اور زانیہ اگر غیر شادی شدہ ہیں تو کوڑے لگاؤ اور اگر شادی شدہ ہیں تو انھیں سنگسار کرو۔

وحی جلی (قرآن) کہتا ہے کہ جنگ کے قیدیوں کو فدیہ دیکر آزاد کر دو یا بطور احسان۔ لیکن اس کے بعد اُسی خدا کی طرف سے وحی خفی آتی ہے کہ نہیں! جنگ کے قیدیوں کو غلام بناؤ اور ان کی عورتوں کو لونڈیاں اور ان لونڈیوں کو بلا حد و شمار اپنے حرم میں داخل کر لو۔

وحی جلی (قرآن) کہتا ہے کہ انسان کو ضمیر کی آزادی حاصل ہے۔ جس کا جی چاہے اسلام لے آئے، جس کا جی چاہے کفر اختیار کرے۔ لیکن وحی خفی کہتی ہے کہ نہیں! اگر کوئی مسلمان، اسلام چھوڑ دے تو اس کی سزا قتل ہے۔

وحی جلی کہتی ہے اور بار بار کہتی ہے کہ تم اپنے مال کو وصیت کی رو سے تقسیم کر سکتے ہو۔ لیکن وحی خفی کہتی ہے کہ یہ وصیت صرف ایک تہائی میں ہو گی اور وہ بھی وارث کے لئے نہیں۔

وحی جلی کہتی ہے کہ یتیموں کا خاص طور پر خیال رکھا کرو۔ لیکن وحی خفی کہتی ہے کہ اگر کوئی بچہ اپنے دادا کی زندگی میں یتیم ہو جائے تو اسے دادا کی میراث میں سے ایک پائی نہ دو۔ تمام کی تمام جائداد اُن بچوں کو دیدو جن کا باپ زندہ ہے۔

وحی جلی کہتی ہے کہ یہ چار چیزیں ہیں جنھیں خدا نے حرام قرار دیا ہے لیکن وحی خفی حرام اور حلال کی طول طویل فہرستیں مرتب کر کے دیتی ہے۔

وحی جلی کہتی ہے کہ خدا نے رسول اللہ کو صرف قرآن بطور معجزہ دیا ہے۔ دین کی تبلیغ علیٰ وجہ البصیرت ہو گی، حسی معجزات کی بنا پر نہیں۔ لیکن وحی خفی کہتی ہے کہ رسول اللہ کو سینکڑوں (بلکہ ہزاروں) حسی معجزات عطا ہوئے تھے

وحی جلی کہتی ہے کہ اللہ کے رسول سچے ہوتے ہیں وہ کبھی جھوٹ نہیں بولتے۔ لیکن وحی خفی کہتی ہے کہ یہ غلط ہے۔ حضرت ابراہیمؑ نے تین مرتبہ جھوٹ بولا تھا اور جھوٹ بھی ایسا جس کے احساس سے وہ (معاذ اللہ) روزِ محشر خدا کے حضور جانے سے نادم ہوں گے۔

وحی جلی کہتی ہے کہ خدا کی کتاب (قرآن کریم) کا ہر حکم اپنی جگہ محکم، مستقل اور ابدی ہے لیکن وحی خفی کہتی ہے کہ نہیں، اس میں بہت سے احکام ایسے ہیں جو منسوخ ہو چکے ہیں اور یونہی برائے وزنِ بیت اس میں رہنے دیئے ہیں۔

وحی جلی کہتی ہے کہ خدا کی کتاب بالکل محفوظ ہے لیکن احادیث کہتی ہیں کہ ایسی آیات (مثلاً آیتِ رجم) بھی ہیں جو پہلے قرآن میں

ہوا کرتی تھیں لیکن بعد میں اس میں نہ رہیں۔

ان چند مثالوں سے آپ اندازہ فرما لیجئے کہ وحی جلی اور وحی خفی کا باہمی تعلق کیا ہے۔ یعنی خدا پہلے ایک حکم دیدیتا ہے کہ اسے قرآن میں درج کر لو اور اس کے بعد اس کے خلاف حکم دیدیتا ہے اور کہتا ہے کہ اسے قرآن میں درج نہ کرنا، الگ رکھنا۔ لیکن عمل اسی پر کرنا۔

ہم یہ لکھ رہے ہیں اور ہمارا کلیجہ کانپ رہا ہے کہ اس قسم کے دین کے متعلق دنیا کیا اندازہ لگاتی ہوگی۔ مودودی صاحب اس سے بھی ایک قدم آگے بڑھتے ہیں۔ ذرا غور سے سنئے۔ دریافت کیا گیا کہ اگر رسول اللہؐ کی متعین فرمودہ جزئیات، عین دین ہیں اور قیامت تک کے لئے غیر متبدل تو یہ جو ہم دیکھتے ہیں کہ مسلمانوں کے مختلف فرقوں میں (مثلاً) نماز کی جزئیات میں فرق ہے اور یہ فرق خود روایات کی رو سے ہے، تو آج اس امر کا پتہ کس طرح لگایا جائے کہ ان میں سے کونسی چیز رسول اللہؐ کی متعین فرمودہ ہے۔ اس کے جواب میں آپ ارشاد فرماتے ہیں کہ

> یہ اختلاف اس امر کا پتہ دیتا ہے کہ مختلف لوگوں نے مختلف اوقات میں حضورؐ کا عمل مختلف دیکھا، چونکہ یہ امور نماز میں کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتے اور ان میں سے کسی کے کرنے یا کسی کے نہ کرنے سے نماز میں کوئی خلل واقعہ نہیں ہوتا۔ اور حضورؐ خود صاحب شریعت تھے اس لئے آپ جس وقت جیسا چاہتے تھے عمل فرماتے تھے لیکن حضورؐ کے سوا کوئی اور شخص چونکہ صاحب شریعت نہ تھا اور اس کا کام اتباع تھا نہ کہ تشریع۔ اسلئے ہر دیکھنے والے نے آپ کو جیسا فعل کرتے دیکھا اس کی پیروی کی اور اسی کی پیروی کیلئے لوگوں سے کہا۔ (ص ۳۳۱)

مودودی صاحب پہلے فرما چکے ہیں کہ

(۱) آنحضرتؐ جس وقت جس حالت میں جو کچھ بھی کرتے تھے رسول کی حیثیت سے کرتے تھے۔ (ص ۲۴۲)

(۲) رسولؐ کی ہر بات خدا کی طرف سے ہوتی ہے۔ (ص ۲۴۲)

(۳) آپؐ کا ہر فعل اور ہر قول رسولِ خدا کی حیثیت سے تھا۔ (ص ۲۴۱)

اس کے بعد مودودی صاحب کے اقتباس بالا کو ملاحظہ فرمائیے جس میں ارشاد ہوتا ہے کہ

(i) رسول اللہؐ کا مختلف اوقات میں مختلف عمل ہوتا تھا۔

(ii) اس قسم کے اختلافی امور نماز میں کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتے تھے۔

(iii) اس لئے جس نے جس طرح دیکھا اسی طرح پیروی کرنے لگ گیا۔

اگر رسول اللہؐ کا ہر فعل وحی کی رو سے اور رسول کی حیثیت سے ہوتا تھا تو اس سے لازم آیا کہ ایک وقت میں وحی کی رو سے

جزئیات کسی طرح متعین ہوا کرتی تھیں اور دوسرے وقت میں کسی اور طرح۔ لیکن اس کے ساتھ ہی مودودی صاحب کا ارشاد ہے کہ "آپ صاحبِ شریعت تھے، جس وقت جیسا چاہتے تھے عمل فرماتے تھے"۔ اگر "حضورؐ جیسا چاہتے تھے عمل فرماتے تھے" تو پھر ان اعمال میں وحی کا کیا دخل ہوتا تھا؟ پھر مودودی صاحب یہ بھی فرماتے ہیں کہ یہ اختلافی امور نماز میں خاص اہمیت نہیں رکھتے تھے یعنی یہ تمام امور منجانب اللہ ہوتے تھے اور حضورؐ بہ حیثیتِ رسول ان امور کو ادا فرماتے تھے۔ لیکن بایں ہمہ، یہ امور نماز میں خاص اہمیت نہیں رکھتے تھے! سوچئے کہ یہ کس قسم کا دین ہے؟

اس کے بعد یہ چیز بھی غور طلب ہے کہ مودودی صاحب کو یہ کس طرح معلوم ہو گیا کہ نماز میں فلاں فلاں بات تو اہمیت رکھتی ہے اور فلاں فلاں بات خاص اہمیت نہیں رکھتی!

اسے کہتے ہیں تلاعب بالدین۔ یعنی دین کے ساتھ کھیلنا۔

اب اسی ضمن میں ایک اور بات دیکھئے اور سوچئے کہ اسے کیا کہا جائے۔ مودودی صاحب نے فرمایا ہے کہ قرآن اصول کی کتاب ہے اور احادیث ان اصولوں کی تشریح اور تفصیل ہیں۔ اس کے مقابل میں مودودی صاحب کے اس دعویٰ کو سامنے لائیے جس سے اس بحث کا آغاز ہوا ہے یعنی ان کا یہ ارشاد کہ

> حدیث کے مستقل ماخذ ہونے کی نفی سے اگر مراد یہ ہے کہ اس کی حیثیت صرف شارح اور مفسر کی ہے یعنی وہ انہی مسائل و وقائع کی وضاحت کرتی ہے جن کا مجملاً ذکر قرآن میں آ گیا ہے اور خود اس کی اپنی مستقل حیثیت کچھ نہیں تو یہ دعویٰ واقعہ کے خلاف ہے۔ . . . . مسائل و احکام کے باب میں حدیث ایک مستقل ماخذ کی حیثیت رکھتی ہے۔
>
> (ترجمان القرآن بابت ستمبر ۱۹۵۰ء)

یعنی پہلے یہ ارشاد تھا کہ قرآن کتابِ اصول ہے اور ان اصولوں کی شرح و تفسیر احادیث ہیں۔ لیکن اب ارشاد ہوتا ہے کہ نہیں! احادیث کی حیثیت شرح و تفسیر کی نہیں۔ مسائل و احکام میں ان کی حیثیت ایک مستقل ماخذ کی ہے۔ کیا دین کے ایسے اہم بنیادی معاملہ میں ایسے متضاد تصورات کہیں اور بھی دیکھنے میں آئے ہیں؟ توبہ توبہ کتنی بڑی جرأت ہے ان لوگوں کی!

اب آگے بڑھئے۔ وحی کی ان دو قسموں کے تذکرہ کے بعد مودودی صاحب فرماتے ہیں کہ

> جب یہ دونوں چیزیں رسول اللہؐ کے اتباع اور آپ کے نمونۂ حیات کی تقلید کے ساتھ وابستہ ہیں تو لازم ہو کہ سیرتِ نبویؐ کے وہ پاک نمونے اور زبان وحی ترجمان کے وہ مقدس احکام بھی قرآن کے ساتھ ساتھ باقی رہیں جن سے رسول اللہؐ کے

ہم عہد لوگوں نے ہدایت پائی تھی ورنہ بعد کی نسلوں کے لئے ہدایت ناقص رہ جائے گی۔ (ص۲۹۴)

اس سے ذرا آگے چل کر فرماتے ہیں:

اس بحث سے یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ کتاب اللہ کے ساتھ سنت رسول اللہؐ کا رہنا قطعاً ناگزیر اور ضروری ہے۔ (ص۲۹۶)

چنانچہ اس کے لئے

جس خدا نے اپنی آخری کتاب کی حفاظت کا غیر معمولی انتظام کیا ہے اس نے اپنے آخری نبیؐ کے نقوشِ قدم اور آثارِ ہدایت کی حفاظت کے لئے بھی وہ انتظام کیا ہے جو اپنی نظیر آپ ہی ہے۔ (ص۳۱۷)

یعنی

(i) کتاب اللہ کے ساتھ احادیث کا رہنا قطعاً ناگزیر ہے۔

(ii) اگر احادیث ساتھ نہ رہیں تو بعد کی نسلوں کے لئے ہدایت ناقص رہ جاتی ہے۔

(iii) اس لئے اللہ تعالیٰ نے جس طرح قرآن کی حفاظت کا انتظام کیا اسی طرح احادیث رسول اللہؐ کی حفاظت کا بھی انتظام کر دیا۔

یہ ٹھیک ہے۔ اللہ تعالیٰ کو ایسا ہی کرنا چاہئے تھا۔ قرآن اور احادیث، دونوں اسی کی کتاب کی دو جلدیں، اسی کی وحی کے دو حصے اور اسی کے دین کے دو گوشے تھے۔ وہ ایسا کس طرح سے کر سکتا تھا کہ ان میں سے ایک حصہ کی حفاظت کا تو انتظام کر دیتا اور دوسرے حصہ کو ایسے ہی چھوڑ دیتا۔

اللہ تعالیٰ نے یہ عدیم النظیر انتظام کس طرح سے فرمایا؟ اس کی تفصیل مودودی صاحب نے خود ہی بیان فرمادی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

(اس زمانہ میں) ضبط اور نقل کا ذریعہ جو کچھ بھی تھا وہ لوگوں کا حافظہ اور زبانیں تھیں۔ قدیم زمانہ میں نہ صرف عرب بلکہ تمام قوموں کے پاس واقعات کو محفوظ رکھنے کا اور بعد کی نسلوں تک پہنچانے کا یہی ایک ذریعہ تھا۔ مگر عرب خصوصیت کے ساتھ اپنے حافظہ اور صحت نقل میں ممتاز تھے۔ (ص۲۹۷)

اس سے واضح ہے کہ مودودی صاحب کے نزدیک قرآن کی حفاظت کا انتظام بھی صرف حافظہ کی رو سے کیا گیا تھا۔ قرآن کہیں لکھا ہوا موجود نہ تھا۔ اسلئے کہ اس زمانہ میں ضبط و نقل کا ذریعہ ہی حافظہ تھا۔ دوسرا کوئی ذریعہ ہی نہ تھا۔

بہت اچھا۔ اللہ تعالیٰ نے احادیث کی حفاظت کا انتظام یہ کیا کہ انھیں لوگوں کے حافظہ میں محفوظ کرا دیا۔ اب آگے بڑھئے۔ فرماتے ہیں:

صداقت کے ساتھ صرف یہی کہا جا سکتا ہے کہ پہلی صدی کے آخر سے حدیث کے ذخیرے میں ایک حصہ ایسی روایات کا بھی داخل ہونے لگا تھا جو موضوع تھیں اور یہ کہ بعد کی نسلوں کو جو احادیث پہنچیں ان میں صحیح اور غلط اور مشکوک سب قسم کی ملی جلی تھیں۔ (ص۳۰۰)

یہ ہوا نتیجہ اُس عدیم النظیر انتظام کا جو اللہ تعالیٰ نے احادیث کی حفاظت کے لئے اختیار فرمایا تھا! خدائی انتظام بالآخر خدائی انتظام ہی ہوتے ہیں!! اللہ تعالیٰ نے احادیث کی حفاظت کا انتظام اس لئے فرمایا تھا کہ

اگر احادیث محفوظ نہ رہیں تو آنے والی نسلوں کے لئے ہدایت ناقص رہ جائے گی۔

اور ہوا یہ کہ

پہلی ہی صدی کے بعد آنے والی نسلوں کو جو احادیث پہنچیں ان میں صحیح اور غلط اور مشکوک سب قسم کی حدیثیں ملی جلی تھیں۔

دیکھا آپ نے کہ اللہ نے اپنی ہدایت کو قیامت تک کے انسانوں کیلئے کس طرح محفوظ رکھا! اس کے بعد مودودی صاحب فرماتے ہیں کہ

(۱) یہ بالکل صحیح ہے کہ احادیث اس حد تک محفوظ نہیں ہیں جس حد تک قرآن مجید ہے۔ اور

(۲) یہ بات ناقابل انکار ہے کہ علم کا جیسا مستند اور معتبر ذریعہ قرآن مجید ہے ویسا مستند اور معتبر ذریعہ حدیث نہیں ہے (ص ۳۸-۳۳۹)

یہ وہی احادیث ہیں جن کے متعلق ابھی ابھی ارشاد ہوا تھا کہ

رسول اللہؐ نے جو کچھ استاد کی حیثیت سے بتایا اور سکھایا ہے وہ بھی اسی طرح خدا کی طرف سے ہے جس طرح قرآن خدا کی طرف سے ہے اس کو غیر از قرآن کہنا صحیح نہیں ہے۔ (ص ۳۳۶)

اور اللہ نے جن کی حفاظت کا ایسا انتظام کیا تھا "جو اپنی نظیر آپ تھا"

مودودی صاحب نے فرمایا ہے کہ عربوں کا حافظہ بہت قوی تھا اس لئے انہوں نے احادیث کو حفظ کر لیا اور یہی حفظ کردہ احادیث آگے منتقل ہوئیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ رسول اللہ کے ارشادات بلفظہٖ حفظ کر لئے جاتے تھے اور وہی الفاظ آگے منتقل ہوتے چلے جاتے تھے۔ یا رسول اللہ جو کچھ کرتے تھے وہ سب کچھ اسی طرح نقل ہوتا چلا جاتا تھا۔ لیکن ذرا آگے چل کر وہ خود ہی ارشاد فرماتے ہیں کہ احادیث کے اختلاف کی وجہ کچھ اور تھی۔ لکھتے ہیں:

بادی النظر میں یہ بات بالکل صحیح معلوم ہوتی ہے کہ ایسی فعلی اور قولی احادیث کو تواتر کا درجہ حاصل ہونا چاہئے جن کے دیکھنے اور سننے والے بکثرت ہوں۔ ان میں اختلاف نہ پایا جانا چاہئے۔ لیکن ہر شخص بادنیٰ تامل یہ سمجھ سکتا ہے کہ جس واقعہ کو بکثرت لوگوں نے دیکھا ہو، یا جس تقریر کو بکثرت لوگوں نے سنا ہو، اس کو نقل کرنے یا اس کے مطابق عمل کرنے میں سب لوگ اس قدر متفق نہیں ہو سکتے کہ ان کے درمیان یک سر مو فرق نہ پایا جائے۔ اس واقعہ یا اُس تقریر کے اہم اجزا میں تو سب کے درمیان ضرور اتفاق ہوگا مگر فرعی امور میں بہت کچھ اختلاف بھی پایا جائے گا اور یہ اختلاف ہرگز اس بات کی دلیل نہ ہوگا کہ وہ واقعہ سرے سے پیش ہی نہیں آیا۔ مثال کے طور پر آج میں ایک تقریر کرتا ہوں اور کئی ہزار آدمی اس کو سنتے ہیں۔ جلسہ ختم ہونے کے چند گھنٹے بعد ہی (مہینوں اور برسوں بعد نہیں بلکہ چند ہی گھنٹے بعد) لوگوں سے پوچھ لیجئے کہ مقرر نے کیا کہا؟

آپ دیکھیں گے کہ تقریر کا مضمون نقل کرنے میں سب کا بیان یکساں نہ ہوگا۔ کوئی کسی ٹکڑے کو بیان کرے گا، کوئی کسی ٹکڑے کو۔ کوئی کسی جملے کو لفظ بلفظ نقل کرے گا، کوئی اس مفہوم کو جو اس کی سمجھ میں آیا ہے اپنے الفاظ میں بیان کر دے گا۔ کوئی زیادہ فہیم آدمی ہوگا اور تقریر کو ٹھیک ٹھیک سمجھ کر اس کا صحیح ملخص بیان کرے گا۔ کسی کی سمجھ زیادہ اچھی نہ ہوگی اور وہ مطلب کو اپنے الفاظ میں اچھی طرح نہ ادا کر سکے گا۔ کسی کا حافظہ اچھا ہوگا اور وہ تقریر کے اکثر حصے لفظ بلفظ نقل کر دیگا کسی کی یاد اچھی نہ ہوگی اور وہ نقل و روایت میں غلطیاں کرے گا۔ (ص ۳۲۹-۳۳۰)

یہ دوسری مثال ہے اس عدیم النظیر انتظام کی جو اللہ تعالیٰ نے اپنی وحی کے اس حصہ کو محفوظ رکھنے کے لئے اختیار فرمایا۔

بہرحال مودودی صاحب کو تسلیم ہے کہ احادیث کے جو مجموعے مرتب ہوئے ان میں (اللہ تعالیٰ کی تمام کوششوں کے باوجود) موضوع اور مشکوک احادیث بھی شامل ہو گئیں۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ کے انتظام کی تیسری کڑی سامنے آتی ہے۔ یعنی ائمہ جرح و تعدیل نے ان احادیث کو پرکھا اور معتبر اور غیر معتبر احادیث کو الگ الگ کر دیا۔ نقد احادیث کے اس کارنامہ کو اسلام کی تاریخ میں بڑی اہمیت دی جاتی ہے اور انہی ائمہ جرح و تعدیل کے فیصلوں کے مطابق احادیث کو قوی اور ضعیف تسلیم کیا جاتا ہے۔ لیکن سنئے کہ مودودی صاحب انتظام خداوندی کے اس شعبہ کے متعلق کیا فرماتے ہیں۔ ارشاد ہے:

دوسرے گروہ کو لیجئے جو دوسری انتہا کی طرف چلا گیا ہے یہ لوگ محدثین کے اتباع میں جائز حد سے بہت زیادہ تشدد اختیار کرتے ہیں۔ ان کا قول یہ ہے کہ محدثین کرام نے دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ کر کے رکھ دیا ہے۔ اب ہمارا کام صرف یہ ہے کہ ان بزرگوں نے احادیث کے جو درجے مقرر کر دیئے ہیں انہی کے مطابق ہم ان کو اعتبار اور حجیت کا مرتبہ دیں۔ مثلاً جو قوی الاسناد ہے اس کے مقابلہ میں ضعیف الاسناد کو چھوڑ دیں۔ . . . . . محدثین رحمہم اللہ کی خدمات مسلّم۔ یہ بھی مسلّم کہ نقد حدیث کیلئے جو مواد انھوں نے فراہم کیا ہے وہ صدر اول کے اخبار و آثار کی تحقیق میں بہت کارآمد ہے کلام اس میں نہیں بلکہ صرف اس امر میں ہے کہ کلیتہً ان پر اعتماد کرنا کہاں تک درست ہے۔ وہ بہرحال تھے تو انسان ہی، انسانی علم کیلئے جو حدیں فطرۃً اللہ نے مقرر کر رکھی ہیں، ان سے آگے تو وہ نہیں جا سکتے تھے۔ انسانی کاموں میں جو نقص فطری طور پر رہ جاتا ہے اس سے تو ان کے کام محفوظ نہ تھے۔ پھر آپ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ جس کو وہ صحیح قرار دیتے ہیں وہ حقیقت میں بھی صحیح ہے؟ صحت کا کامل یقین تو خود ان کو بھی نہ تھا۔ (ص ۳۱۸)

پھر تحریر فرماتے ہیں:

محدثین کرام نے اسماء الرجال کا عظیم الشان ذخیرہ فراہم کیا جو بلاشبہ نہایت بیش قیمت ہے۔ مگر ان میں کونسی چیز ہے جس میں غلطی کا احتمال نہ ہو۔ (ص ۳۱۹)

غلطیاں بھی محض سہو و خطا کی بنا پر نہیں بلکہ اس بنا پر کہ

نفس ہر ایک کے ساتھ لگا ہوا تھا اور اس بات کا قوی امکان تھا کہ اشخاص کے متعلق اچھی یا بری رائے قائم کرنے میں ان کے ذاتی رجحانات کا بھی کسی حد تک دخل ہو جائے۔ یہ امکان محض امکان عقل نہیں بلکہ اس امر کا ثبوت موجود ہے۔ (ص ۳۱۹)

اس کے بعد انھوں نے مثالیں دی ہیں جن سے ثابت کیا گیا ہے کہ رواۃ احادیث کو ثقہ اور غیر ثقہ قرار دینے میں ائمہ جرح و تعدیل کا ذاتی رجحان کیا کچھ کرتا تھا۔ اس کے بعد ارشاد ہے:

اس قسم کی مثالیں پیش کرنے سے ہمارا مقصد یہ نہیں ہے کہ اسماء الرجال کا سارا علم غلط ہے بلکہ ہمارا مقصد صرف یہ ظاہر کرنا ہے کہ جن حضرات نے رجال کی جرح و تعدیل کی ہے وہ بھی تو آخر انسان تھے۔ بشری کمزوریاں ان کے ساتھ بھی لگی ہوئی تھیں۔ کیا ضرور ہے کہ جس کو انھوں نے ثقہ قرار دیا ہو وہ بالیقین ثقہ اور تمام روایتوں میں ثقہ ہو اور جس کو انھوں نے غیر ثقہ ٹھہرایا ہو وہ بالیقین غیر ثقہ ہے۔ (ص ۳۲۱)

پھر فرماتے ہیں:

ان سب چیزوں کی تحقیق انھوں نے اسی حد تک کی ہے جس حد تک انسان کر سکتے تھے۔ مگر لازم نہیں کہ ہر روایت کی تحقیق میں یہ سب امور ان کو ٹھیک ٹھیک ہی معلوم ہو گئے ہوں۔ بہت ممکن ہے کہ جس روایت کو وہ متصل السند قرار دے رہے ہیں وہ درحقیقت منقطع ہو الخ ..... یہ اور ایسے ہی بہت سے امور ہیں جن کی بنا پر اسناد اور جرح و تعدیل کے علم کو کلیتہً صحیح نہیں سمجھا جا سکتا۔ یہ مواد اس حد تک قابل اعتماد ضرور ہے کہ سنت نبوی اور آثار صحابہ کی تحقیق میں اس سے مدد لی جائے اور اس کا مناسب لحاظ کیا جائے مگر اس قابل نہیں ہے کہ بالکل اسی پر اعتماد کر لیا جائے۔ (ص ۳۲۲)

جو کچھ مودودی صاحب نے تحریر فرمایا ہے اس کے پیش نظر لامحالہ انسان اسی نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ یہ ناممکن ہے کہ ہم یقینی طور پر کہہ سکیں کہ کونسی بات فی الواقعہ رسول اللہ کا ارشاد ہے اور کونسی بات ایسی ہے جس میں کچھ اور بھی شامل ہو چکا ہے۔ اس کے بعد انسان اس منطقی نتیجہ پر پہنچ جاتا ہے کہ

(i) احادیث کی حفاظت کا انتظام اللہ نے تو نہیں کیا کیونکہ خدا کا انتظام ایسا ناقص نہیں ہو سکتا۔ اس نے قرآن کی حفاظت کا انتظام کیا اور دیکھئے کیا مکمل انتظام کیا۔

(ii) لہٰذا اس سے ظاہر ہے کہ احادیث کا محفوظ رکھا جانا منشاء خداوندی نہ تھا۔ کیونکہ اگر خدا کا یہ منشا ہوتا تو کس کی مجال تھی

کہ ان میں ذرا بھی ردوبدل یا تحریف والحاق کر سکتا۔

(iii) چونکہ خدا نے احادیث کو محفوظ رکھنے کا انتظام نہیں کیا اسلئے ظاہر ہے کہ یہ دین کا حصہ نہ تھیں۔ دین قیامت تک غیر متبدل رہنے والی شے ہے۔ اور غیر متبدل شے ہمیشہ محفوظ رکھی جاتی ہے۔

(iv) لہٰذا احادیث کی وقتی حیثیت جو بھی ہو، یہ منشاء خداوندی نہیں تھا کہ یہ ابدی طور پر واجب الاتباع رہیں۔ اگر انھیں واجب الاتباع رہنا تھا تو ان کا محفوظ رکھا جانا بھی ضروری تھا۔

لیکن مودودی صاحب، اس نقص انتظام کا اقرار کرنے کے باوجود مصر ہیں کہ احادیث قیامت تک کے لئے واجب الاتباع ہیں۔ اگر خدا کا انتظام اس باب میں ناکام رہا ہے تو اس کا یہ مطلب تھوڑا ہے کہ ہم انھیں دین ہی تسلیم نہ کریں، یہ دین ہیں اور دین ہی رہیں گی۔ اس پر یہ سوال پیدا ہوا کہ غلط اور صحیح کے اس ذخیرے سے یہ معلوم کس طرح کیا جائے کہ کونسی احادیث صحیح ہیں اور کونسی غلط! دیکھئے اس کے جواب میں کیا ارشاد ہوتا ہے:

> مگر جس طرح شاہدوں کے بیانات کا جانچنا ہر شخص کے بس کی بات نہیں ہے اسی طرح درایت بھی بچوں کا کھیل نہیں ہے۔ حدیث کو اصول درایت پر وہی شخص جانچ سکتا ہے جس نے قرآن کا علم حاصل کر کے اسلام کے اصول اولیہ کو خوب سمجھ لیا ہو، اور جس نے حدیث کے بیشتر ذخیرہ کا گہرا مطالعہ کر کے احادیث کو پرکھنے کی نظر بہم پہنچائی ہو۔ کثرت مطالعہ اور ممارست سے انسان میں ایک ایسا ملکہ پیدا ہو جاتا ہے جس سے وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مزاج شناس ہو جاتا ہے اور اسلام کی صحیح روح اس کے دل و دماغ میں بس جاتی ہے۔ پھر وہ ایک حدیث کو دیکھ کر اول نظر میں سمجھ لیتا ہے کہ آیا رسول اللہ ایسا فرما سکتے تھے یا نہیں؟ یا آپ کا عمل ایسا ہو سکتا تھا یا نہیں؟ (صفحہ ۳۰۲)

اس کی تشریح میں دوسرے مقام پر فرماتے ہیں:

> یہ دوسری کسوٹی کونسی ہے؟ ہم اس سے پہلے بھی اشارۃً اس کا ذکر کئی مرتبہ کر چکے ہیں۔ جس شخص کو اللہ تعالیٰ تفقہ کی نعمت سے سرفراز فرماتا ہے اس کے اندر قرآن اور سیرت رسولؐ کے غائر مطالعہ سے ایک خاص ذوق پیدا ہو جاتا ہے جس کی کیفیت بالکل ایسی ہوتی ہے جیسے ایک پرانے جوہری کی بصیرت کہ وہ جواہر کی نازک سے نازک خصوصیات تک کو پرکھ لیتی ہے۔ اس کی نظر بہ حیثیت مجموعی شریعت حقہ کے پورے سسٹم پر ہوتی ہے اور وہ اس سسٹم کی طبیعت کو پہچان جاتا ہے۔ اس کے بعد جب جزئیات اس کے سامنے آتے ہیں تو اس کا ذوق اسے بتا دیتا ہے کہ کونسی چیز اسلام کے مزاج اور اس کی طبیعت سے مناسبت رکھتی ہے اور کونسی نہیں رکھتی۔ روایات پر جب وہ نظر ڈالتا ہے تو ان میں بھی یہی کسوٹی ردوقبول کا معیار بن جاتی ہے۔ اسلام کا مزاج عین ذات نبویؐ کا مزاج ہے۔ جو شخص اسلام کے مزاج کو سمجھتا ہے

اور جس نے کثرت کے ساتھ کتاب اللہ وسنت رسول اللہؐ کا گہرا مطالعہ کیا ہوتا ہے وہ نبی اکرمؐ کا ایسا مزاج شناس ہو جاتا ہے کہ روایات کو دیکھ کر خود بخود اس کی بصیرت اسے بتا دیتی ہے کہ ان میں سے کونسا قول یا کونسا فعل میرے سرکار کا ہو سکتا ہے اور کونسی چیز سنت نبویؐ سے اقرب ہے۔ یہی نہیں بلکہ جن مسائل میں اس کو قرآن وسنت سے کوئی چیز نہیں ملتی، ان میں بھی وہ کہہ سکتا ہے کہ اگر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے فلاں مسئلہ پیش آتا تو آپ اس کا فیصلہ یوں فرماتے۔ یہ اسلئے کہ اس کی روح، روحِ محمدیؐ میں گم اور اس کی نظر بصیرتِ نبوی کے ساتھ متحد ہو جاتی ہے۔ اس کا دماغ اسلام کے سانچے میں ڈھل جاتا ہے، اور وہ اسی طرح دیکھتا اور سوچتا ہے جس طرح اسلام چاہتا ہے کہ دیکھا اور سوچا جائے۔ اس مقام پر پہنچ جانے کے بعد انسان اسناد کا زیادہ محتاج نہیں رہتا۔ وہ اسناد سے مدد ضرور لیتا ہے مگر اس کے فیصلے کا مدار اُس پر نہیں ہوتا۔ وہ بسا اوقات ایک غریب، ضعیف، منقطع السند، مطعون فیہ حدیث کو بھی لے لیتا ہے اس لئے کہ اس کی نظر اس افتادہ پتھر کے اندر ہیرے کی جوت دیکھ لیتی ہے۔ اور بسا اوقات وہ ایک غیر معلل، غیر شاذ، متصل السند مقبول حدیث سے بھی اعراض کر جاتا ہے، اس لئے کہ اس جامِ زریں میں جو بادۂ معنیٰ بھری ہوئی ہے وہ اسے طبیعتِ اسلام اور مزاجِ نبویؐ کے مناسب نظر نہیں آتی۔ (ص ۳۲۳-۲۴)

غور فرمایا آپ نے کہ مودودی صاحب کس مقام سے بول رہے ہیں! جو کچھ انھوں نے فرمایا ہے اس کا ملخص یہ ہے کہ

(i) رسول اللہؐ کی احادیث، خدا کی طرف سے وحی ہیں۔ وہ قیامت تک غیر متبدل ہیں۔ ان کی اتباع، خدا کے حکم کی تعمیل اور نبی اکرمؐ کی اطاعت ہے۔

(ii) ان احادیث کا کوئی مستند مجموعہ نہ خدا نے مرتب کر کے دیا نہ اس کے رسولؐ نے۔

(iii) محدثین نے ان مجموعوں کو مرتب کیا ہے لیکن ان کے فیصلے قابلِ سند نہیں ہیں۔

(iv) یہ وہی شخص بتا سکتا ہے کہ جو رسول کا مزاج شناس ہو کہ رسول اللہؐ نے کیا فرمایا تھا۔

(v) نہ صرف یہ کہ ان مجموعوں میں ارشاداتِ رسول اللہؐ کون سے ہیں بلکہ اگر کوئی نیا معاملہ پیش آجائے تو یہ بھی بتا سکتا ہے کہ اس باب میں رسول اللہؐ کیا حکم دیتے۔

(vi) لہٰذا خدا کا دین، اس کی عبدیت، رسول اللہؐ کی اتباع، اس شخص کے فیصلوں کی اطاعت کا نام ہوا۔

یہ ہے وہ نظامِ اطاعت جو اللہ نے اپنے آخری دین کی حیثیت سے قیامت تک کیلئے نافذ العمل رہنے کیلئے عطا فرمایا تھا۔

اب اس "مزاج شناس ذات رسالتمآبؐ" کے اختیارات ملاحظہ فرمائیے۔ فرماتے ہیں:

مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کو نمونہ قرار دینے اور آپ کے اتباع کا حکم دینے سے یہ مراد نہیں کہ آپ نے جو کچھ کیا اور جس

طرح کیا، لوگ بھی بعینہٖ وہی فعل اسی طرح کریں، اور اپنی زندگی میں آپ کی حیاتِ طیبہ کی ایسی نقل اتاریں کہ اصل اور نقل میں کوئی فرق نہ رہے۔ یہ مقصد نہ قرآن کا ہے، نہ ہو سکتا ہے۔ دراصل یہ ایک عام اور اجمالی حکم ہے جس پر عمل کرنے کی صحیح صورت ہم کو خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم اور صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے طریقہ سے معلوم ہو جاتی ہے۔ یہاں اس کی تفصیل کا موقع نہیں۔ مجملاً میں عرض کرتا ہوں کہ جو امور براہِ راست دین اور شریعت سے تعلق رکھتے ہیں ان میں تو حضورؐ کے ارشادات کی اطاعت اور آپ کے عمل کی پیروی طابق النعل بالنعل کرنی ضروری ہے۔ مثلاً نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ اور طہارت وغیرہ مسائل کہ ان میں جو کچھ آپ نے حکم دیا ہے اور جس طرح خود عمل کر کے بتایا ہے اس کی ٹھیک ٹھیک پیروی کرنی لازم ہے۔ رہے وہ امور جو براہِ راست دین سے تعلق نہیں رکھتے، مثلاً تمدنی، معاشی اور سیاسی معاملات اور معاشرت کے جزئیات تو ان میں بعض چیزیں ایسی ہیں جن کا حضورؐ نے حکم دیا ہے یا جن سے بچنے کی تاکید فرمائی ہے۔ بعض ایسی ہیں جن میں حضورؐ نے حکمت اور نصیحت کی باتیں ارشاد فرمائی ہیں۔ اور بعض ایسی ہیں جن میں حضورؐ کے طرزِ عمل سے مکارمِ اخلاق اور تقویٰ و پاکیزگی کا سبق ملتا ہے۔ اور ہم آپ کے طریقہ کو دیکھ کر معلوم کر سکتے ہیں کہ عمل کے مختلف طریقوں میں سے کونسا طریقہ روحِ اسلامی سے مطابقت رکھتا ہے۔ پس اگر کوئی شخص نیک نیتی کے ساتھ حضورؐ کا اتباع کرنا چاہے اور اسی غرض سے آپ کی سنت کا مطالعہ کرے تو اس کیلئے یہ معلوم کرنا کچھ بھی مشکل نہیں کہ کن امور میں آپ کا اتباع طابق النعل بالنعل ہونا چاہئے، اور کن امور میں آپ کے ارشادات اور اعمال سے اصول اخذ کر کے قوانین وضع کرنے چاہئیں اور کن امور میں آپ کی سنت سے اخلاق و حکمت اور خیر و صلاح کے عام اصول مستنبط کرنے چاہئیں۔ (ص ۲۷۵)

یہ وہی مودودی صاحب ہیں جو ابھی ابھی فرما چکے تھے کہ

جس وقت اللہ تعالیٰ نے آپ کو منصبِ رسالت سے سرفراز کیا اس وقت سے لیکر حیاتِ جسمانی کے آخری سانس تک آپ ہر آن اور ہر حال میں خدا کے رسول تھے۔ آپ کا ہر فعل اور ہر قول رسولِ خدا کی حیثیت سے تھا۔ اسی حیثیت میں آپ مبلغ اور معلم بھی تھے، مربی اور مزکی بھی تھے۔ قاضی اور حاکم بھی تھے۔ امام اور امیر بھی تھے۔ حتیٰ کہ آپ کی نجی اور شہری زندگی کے سارے حالات بھی اسی حیثیت کے تحت آگئے تھے۔ (ص ۲۴۱)

یعنی پہلے یہ ارشاد ہوا تھا اور اس کے بعد یہ کہ "تمدنی، معاشی اور سیاسی معاملات اور معاشرت کی جزئیات" میں بعض چیزیں ایسی ہیں جن میں حضورؐ کی اتباع طابق النعل بالنعل ہوگی اور بعض ایسی جن میں رخصت ہوگی۔ اس کا فیصلہ کون کرے گا کہ وہ کون سے امور ہیں جن میں حضورؐ کی اطاعت قدم بقدم کی جائیگی اور کونسے ایسے جن میں آزادی ہوگی؟ "وہی مزاج شناسِ ذاتِ رسالتمآبؐ" اور کون؟

اسی ضمن میں آگے چل کر فرماتے ہیں:

اب رہ گئے احکام، تو قرآن مجید میں ان کے متعلق زیادہ تر کلی قوانین بیان کئے گئے ہیں اور بیشتر امور میں تفصیلات کو چھوڑ دیا گیا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے عملاً ان احکام کو زندگی کے معاملات میں جاری فرمایا اور اپنے عمل اور قول سے ان کی تفصیلات ظاہر فرمائیں۔ ان تفصیلات میں سے بعض ایسی ہیں جن میں ہمارے اجتہاد کو کوئی دخل نہیں۔ ہم پر لازم ہے کہ جیسا عمل حضورؐ سے ثابت ہے اسی کی پیروی کریں۔ مثلاً عبادات کے احکام اور بعض تفصیلات ایسی ہیں کہ ان سے ہم اصول اخذ کر کے اپنے اجتہاد سے فروع مستنبط کر سکتے ہیں، مثلاً عہد نبویؐ کے قوانین مدنی۔ اور بعض تفصیلات ایسی ہیں کہ ان سے ہم کو اسلام کی اسپرٹ معلوم ہوتی ہے، اگر یہ اسپرٹ ہمارے قلب و روح میں جاری و ساری ہو جائے تو ہم اس قابل ہو جائیں گے کہ زندگی کے جملہ معاملات اور مسائل پر ایک مسلمان کی سی ذہنیت اور ایک مسلمان کی سی بصیرت کے ساتھ غور کریں، دنیا کے علمی اور عملی مسائل کو اسلامی نقطۂ نظر سے دیکھیں اور ان کے متعلق وہی رائے قائم کریں جیسی ایک مسلمان کو کرنی چاہئے۔ (صلعم ۳۴۲)

اس بات کا فیصلہ بھی وہی "مزاج شناس" کر سکے گا کہ وہ کونسی تفاصیل ہیں جن میں ہم اپنے اجتہاد سے فروع مستنبط کر سکتے ہیں اور وہ کونسی جن میں ہمارے اجتہاد کو کوئی دخل نہیں ہوگا۔ یعنی

(i) قرآن کتاب اصول ہے اس لئے اس سے عملی جزئیات میں ہدایت نہیں مل سکتی۔

(ii) عملی جزئیات احادیث ہیں جن کی اطاعت فرض ہے۔

(iii) احادیث صحیح بھی ہیں اور غلط بھی۔ جو صحیح ہیں ان میں بھی بعض ایسی ہیں جو واجب الاتباع ہیں اور بعض ایسی جن کی اتباع ضروری نہیں۔ جن کی اتباع ضروری ہے ان میں بعض ایسی ہیں جن میں اجتہاد سے استنباط کیا جا سکتا ہے اور بعض ایسی جن میں اجتہاد کی گنجائش نہیں۔

(iv) یہ فیصلہ صرف وہ شخص کر سکتا ہے جو "مزاج شناسِ ذاتِ رسالتمآبؐ" ہو کہ کونسی احادیث صحیح ہیں اور ان میں سے بھی کونسی من وعن واجب الاتباع۔

(v) لہٰذا ظاہر ہے کہ اب امتِ مسلمہ کے لئے ہدایتِ خداوندی کا مدار اس "مزاج شناسِ ذاتِ رسالتمآبؐ" کا فیصلہ رہ گیا۔ اسے نہ کسی سند پیش کرنے کی ضرورت ہے نہ دلیل کی۔ یہ خالص "ذوق" کی چیز ہے جس میں کوئی دوسرا شریک ہی نہیں ہو سکتا۔ جو کچھ موجود ہے اس میں سے بھی وہی دین ہوگا جسے یہ دین کہے گا۔ اور جو کچھ موجود نہیں ہے اس کے متعلق بھی یہی بتائیگا کہ اگر رسول اللہؐ موجود ہوتے تو آپؐ کیا فیصلہ دیتے۔ لہٰذا اس "مزاج شناس" کے فیصلے رسول اللہؐ کے فیصلے ہونگے۔ اور چونکہ رسول اللہؐ کے فیصلے خدا کی وحی ہوتے تھے اسلئے اس کے فیصلے بھی وہی حیثیت رکھیں گے۔ اب اس کی اطاعت خدا اور رسول کی اطاعت ہوگی اور اسکی معصیت خدا اور رسول کی معصیت۔ لہٰذا اب دنیا کو اپنی نجات و سعادت کیلئے اسکی طرف رجوع کرنا ہوگا۔

آؤ کہ یہیں نورِ خدا پاؤ گے!

چونکہ یہ موضوع بہت اہم ہے اسلئے ہم چاہتے ہیں کہ جو کچھ گذشتہ صفحات میں آپ پڑھ چکے ہیں اس کا ملخص پیش کر دیا جائے تاکہ بات اچھی طرح سے ذہن میں مرتسم ہو جائے۔

آغاز سخن مودودی صاحب کے اس دعوے سے ہوا تھا کہ

(ا) احادیث کی حیثیت، محض قرآن کی تشریح اور تفسیر کی حیثیت نہیں بلکہ مسائل و احکام میں احادیث دین کا مستقل ماخذ ہیں۔ اسلئے کہ

(ب) خدا کی طرف سے دو چیزیں وحی کے ذریعے ملی تھیں ایک کتاب اللہ اور دوسرے احادیث رسول اللہ۔

اس کے بعد مودودی صاحب نے جو کچھ فرمایا اس کا خلاصہ یہ ہے کہ

(۱) رسول اللہ زندگی کے ہر سانس میں رسول تھے۔ آپ کی ہر بات ہر حال اور ہر آن میں وحی کی رو سے ہوتی تھی۔

(۲) رسول اللہ اپنے اجتہادات میں غلطی کر جاتے تھے تو اللہ تعالیٰ فوراً اصلاح کر دیتا تھا۔

(۳) رسول اللہ کے اجتہادات، آپ کی خداداد بصیرت کی بنا پر ہوتے تھے۔

(۴) احادیث اقوالِ رسول اللہ ہیں۔

(۵) احادیث، اقوال رسول اللہ نہیں بلکہ قرآن کی طرح وحی ہیں۔ اسی طرح اجتہاداتِ نبوی بھی منزل من اللہ تھے۔ اسے وحی خفی کہا جاتا ہے۔

(۶) وحی خفی کے ذریعے جو کچھ ملتا تھا وہ رسول اللہ کی اپنی ہدایت کیلئے تھا۔ عام ہدایت نامہ اور دستور العمل قرآن ہی تھا۔

(۷) قرآن کتاب اصول ہے۔ احادیث اس کی شرح اور تفسیر ہیں۔

(۸) یہ شرح و تفسیر اسلئے قرآن میں درج نہیں کی گئی کہ اس سے قرآن کی ضخامت بڑھ جاتی۔

(۹) چونکہ قرآن اور احادیث دونوں وحی تھے اس لئے اللہ نے جس طرح قرآن کی حفاظت کا انتظام کیا اسی طرح احادیث کی حفاظت کا بھی انتظام کر دیا۔

(۱۰) عربوں میں نقل و ضبط کا ذریعہ صرف حافظہ تھا اس لئے وحی کی حفاظت حافظہ کی رو سے ہوئی۔

(۱۱) انتظامِ خداوندی کے باوجود پہلی صدی کے بعد ہی احادیث کے مجموعوں میں موضوع اور مشکوک احادیث داخل ہونا شروع ہو گئیں۔

(۱۲) ائمہ جرح و تعدیل نے احادیث اور ان کے رواۃ کے پرکھنے کا بڑا اہم کام کیا۔ لیکن وہ بھی انسان ہی تھے۔ اس لئے یقینی طور پر نہیں کہا جا سکتا کہ جسے انہوں نے صحیح کہدیا وہ صحیح ہے اور جسے غلط کہدیا وہ غلط۔

(۱۳) اب غلط اور صحیح کا فیصلہ وہ شخص کر سکتا ہے جو مزاج شناسِ ذاتِ رسالتمآب ہو۔ یہ بھی وہی بتا سکتا ہے کہ صحیح حدیثوں میں بھی کون کونسی احادیث واجب الاتباع ہیں۔ اور یہ بھی کہ کس کس بات میں اجتہاد کی اجازت ہے اور کس میں نہیں۔

یہ ہیں دلائل اس دعوے کے اثبات کے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے صرف قرآن ہی نہیں ملا بلکہ قرآن کے ساتھ، قرآن کے ہم پایہ (مثلہٗ معہٗ) دوسری چیز بھی ملی جسے مجموعۂ احادیث کہا جاتا ہے۔ ہم اس باب میں کسی مزید تبصرہ یا تنقید کی ضرورت نہیں سمجھتے۔ مودودی صاحب کی تحریروں کے اقتباسات آپ کے سامنے ہیں۔ اگر آپ اصل عبارات دیکھنا چاہیں تو ان کی تصنیف "تفہیمات حصہ اول" لے لیجئے اور اس کے بعد از خود کسی نتیجہ پر پہنچ جائیے۔

جہاں تک محترم مودودی صاحب کے اپنے عقیدت مندوں کے حلقہ کا تعلق ہے، انھیں وہ یہ کہکر "مطمئن" کر اسکتے ہیں کہ طلوعِ اسلام آج سے نہیں، شروع سے اسلامی جماعت کا مخالف چلا آرہا ہے اسلئے ہمیں یہ دیکھنے کی ضرورت ہی نہیں کہ اس نے کیا لکھا ہے۔ جماعتی عقیدتمندی وہ قلعہ ہوتی ہے جس کے اندر انسان کو اپنی مدافعت کیلئے کچھ کہنے یا کرنے کی ضرورت ہی نہیں رہتی۔ جہاں کسی نے کچھ کہا فوراً کہدیا کہ یہ لوگ ہماری جماعت کو کمزور کرنا چاہتے ہیں۔ اس سے جماعتی حمیت جوش میں آجاتی ہے اور کسی کو اتنا سوچنے کی مہلت ہی نہیں دیتی کہ کہنے والے کی بات کو سن لیا جائے اور اس پر غیر جانبدارانہ انداز سے غور کر لیا جائے۔ لیکن جو لوگ اس جماعتی عصبیت سے باہر ہیں ہم ان سے عرض کریں گے کہ جو کچھ گذشتہ صفحات میں لکھا گیا ہے اسے نہایت غور سے دیکھیں اور پھر فیصلہ کریں کہ کیا دینِ خداوندی فی الواقعہ وہی ہے جسے مودودی صاحب پیش فرما رہے ہیں! اور کیا ایسے دین میں انسان خدا کی اطاعت کرتا ہے یا پیشوائیت (Priesthood) کی آمرانہ قوتوں کی!! اسی سے یہ حقیقت بھی آپ کے سامنے آجائے گی کہ یہ لوگ اس پر کیوں مصر ہیں کہ دینِ خداوندی یہی ہے۔ آپ مودودی صاحب کے پیش کردہ دلائل پر غور کیجئے۔ پھر یہ بھی دیکھئے کہ ان کی تحریروں میں کس قدر تضاد ہے۔ (واضح رہے کہ ہم نے تفہیمات سے جن عبارات کے اقتباس پیش کئے ہیں وہ کم و بیش ایک ہی زمانہ کی لکھی ہوئی ہیں اور مودودی صاحب نے ان میں سے کسی سے بھی ابھی تک رجوع نہیں کیا)۔ اب صورتِ حالات یہ ہے کہ اگر مودودی صاحب اس قسم کے کمزور دلائل اور تضاد بیانات کے باوجود اپنے مسلک کو فی الواقعہ حق و صداقت کا مسلک سمجھتے ہیں تو آپ کی علمی بصیرت کے متعلق جو رائے قائم کی جاسکتی ہے وہ ظاہر ہے۔ اور اگر وہ اپنے مسلک کی کمزوری کو محسوس کرنے کے باوجود اس پر قائم ہیں تو اسے مصلحت کوشی ہی سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ نیتوں کا حال خدا ہی بہتر جانتا ہے اس لئے اس کے متعلق حتمی طور پر کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ لیکن ان دونوں صورتوں میں سے کوئی بھی شکل ہو، یہ تو واضح ہے کہ مودودی صاحب کا پیش کردہ مسلک، اس دین کا مسلک نہیں ہے جو اللہ نے انسانوں کی ہدایت کے لئے نبی اکرمؐ کی وساطت سے بھیجا تھا۔

لاہور میں طلوعِ اسلام کی سول ایجنسی
مکتبہ جدید چوک انارکلی کے پاس ہے۔ لہٰذا
مقامی ایجنٹ انہی سے مطلوبہ پرچے طلب کریں۔

علامہ سلم صاحب جیراجپوری مدظلہ العالی کا مکتوبِ گرامی

آپ کے پرچے میری نگاہ سے گزرتے ہیں۔ میں اللہ کا شکر ادا کرتا ہوں کہ کم سے کم ایک قلم ایسا تو جنبش میں ہے جو قرآنِ کریم کی حمایت اور وکالت کا حق ادا کر رہا ہے۔ اور دعا کرتا ہوں کہ اللہ مزید توفیق آپ کو عطا فرمائے اور ان کوششوں کو مقبول کرے۔[1]

بہت سے لوگوں نے مجھ سے "جماعتِ اسلامی" کے متعلق میری رائے دریافت کی ہے اور کرتے ہیں۔ جماعتِ اسلامی عرب و عجم کی نہیں جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائی ہے بلکہ وہ جو مولانا مودودی صاحب کے زیرِ قیادت ہے۔ میں نے چونکہ اس جماعت کی تحریروں کا زیادہ مطالعہ نہیں کیا ہے اسوجہ سے اسکے متعلق کوئی رائے دینے کا حق نہیں رکھتا۔ لیکن قرآن نے دینی ہدایت کے مدعیوں کی شناخت کیلئے ایک کسوٹی رکھی ہے جس سے ہر شخص خواہ عامی ہو یا عالم آسانی کے ساتھ سچے اور جھوٹے پیشواؤں کی تمیز کر سکتا ہے۔ یہ ایک مختصر سی آیت بائیسویں پارہ کے آخر میں ہے:

اِتَّبِعُوا مَنْ لَّا یَسْئَلُکُمْ اَجْرًا وَّھُمْ مُّھْتَدُوْنَ۔

ان لوگوں کی پیروی کرو جو تم سے کسی قسم کا اجر نہ طلب کریں اور وہ سیدھے راستہ پر چل رہے ہوں۔

اس آیت کے دو جز ہیں۔ پہلا تو یہ ہے کہ جو مدعی ہدایت کسی قسم کا اجر طلب کرے وہ اتباع کے قابل نہیں۔ یہ چیز ایسی ہے جس کو ہر کس و ناکس دیکھ کر پرکھ سکتا ہے۔ کیونکہ طلبِ اجر خواہ کسی رنگ میں ہو محسوس شئے ہے۔ کسی طرف سے بھی اگر اس مدعی کا دستِ طلب دراز ہو تو یہ سمجھنا چاہئے کہ یہ پیشوائی اسی غرض کو پورا کرنے کیلئے ہے۔ اور اس نے دین کو دنیا کمانے کیلئے بطور پیشہ اختیار کیا ہے۔ قرآن میں انبیاء کرامؑ کے ذکر میں عام طور پر اور سورۂ شعراء میں ہر نبی کے قصہ میں خاص طور پر اللہ نے بار بار اس بات کو ہر نبی کی زبان سے دہرایا ہے کہ "ما اسئلکم علیہ من اجر" (میں تم سے اس پر کسی اجر کا طالب نہیں ہوں)۔

اجر ایک چھوٹی سی بات ہے لیکن قرآن نے اس کی بار بار تصریح اس لئے کی ہے کہ وہ معیاری چیز ہے۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے تو اس سے بھی زیادہ یہ کہلایا گیا جو سورۂ سبا کے آخری رکوع میں ہے:

قل ما سألتکم من اجر فھو لکم ان اجری الا علی اللہ۔

کہدے کہ جو اجر میں تم سے مانگوں تو وہ تمہارے لئے ہے۔ میرا اجر سوائے اللہ کے کسی پر نہیں ہے۔

اور سورۂ شوریٰ میں فرمایا:

قل لا اسئلکم علیہ اجرا الا المودۃ فی القربیٰ۔

کہدے کہ میں اس پر تم سے کوئی اجر نہیں مانگتا بجز رشتہ کے سلوک کے۔

---

[1] حق شناس نگاہوں کی یہی حوصلہ افزائی ہے جسکے بل بوتے پر طلوعِ اسلام زندہ ہے، ورنہ اس قرآن ناآشنا ماحول میں قرآن کی طرف دعوت دینے والے پرچے کا زندہ رہنا محال ہے۔ اللہ تعالیٰ علامہ ممدوح کی دعاؤں کو شرفِ قبولیت عطا فرمائے اور انھیں تادیر سلامت رکھے کہ اس دور میں انکی ہستی مغتنمات میں سے ہے۔ (طلوعِ اسلام)

یعنی صرف رشتہ کا برتاؤ جیسا میں تمہارے ساتھ کرتا ہوں تم بھی میرے ساتھ کرو کہ یہ معاشرت کے حقوق ہیں۔ باقی تبلیغ رسالت پر میں تم سے کسی اجر کا طالب نہیں ہوں۔ یہاں یہ یاد رکھنا چاہئے کہ خود غرض لوگوں نے اس آیت میں یہ تحریف کر ڈالی ہے کہ قربیٰ کے معنی اقربار کے لئے ہیں اور آیت کا یہ ترجمہ کیا ہے کہ میں تم سے کوئی اجر نہیں چاہتا سوائے اس کے کہ میرے اقربا سے محبت رکھو۔ سوال یہ ہے کہ اس سے بڑھ کر اور کیا اجر ہوگا۔ اقربا سے محبت رکھنے کے معنی یہ ہوئے کہ ان کو خلافت دیدینا اور یہی ان تحریف کرنے والوں کا مقصد تھا۔ حالانکہ آیت میں قربیٰ کا لفظ ہے جس کے معنی ہیں رشتہ یا قرابت۔ ساری عربی زبان میں کہیں قربیٰ کے معنی اقربار کے نہیں آئے۔ قرآن نے بھی اقربار کے لئے کبھی قربیٰ کا لفظ استعمال کیا ہے۔ الغرض دینی ہدایت اور تبلیغ پر کسی قسم کا اجر طلب کرنا خواہ وہ اپنے گزارہ ہی کیلئے کیوں نہ ہو شیطانی کمائی ہے۔ ..... دینی ہدایت و تبلیغ بڑی مقبولیت کا ذریعہ ہے لیکن اس سے پہلے اپنی گزر بسر کا بندوبست کر لینا ضروری ہے، ورنہ اس میں قدم نہ رکھے۔

دوسرا جزو ہے کہ وہ مدعیان ہدایت خود ہدایت یافتہ ہوں۔ یہ عوام کے دیکھنے کی چیز نہیں ہے بلکہ خواص کی ہے جو اس مدعی کے عقائد و اعمال پر نظر ڈال کر دیکھیں گے کہ وہ قرآن کے مطابق بھی ہیں یا نہیں۔

الغرض قرآن کریم کی دی ہوئی اس چھوٹی سی کسوٹی پر عوام اور خواص سب ہر دینی پیشوائی کے دعویدار کو جانچ کر کھرے اور کھوٹے کا امتیاز کر سکتے ہیں۔ میری یا اور کسی کی رائے کسی شخص یا کسی جماعت کے متعلق "علم" نہیں ہے۔

دسمبر نمبر میں آپ نے مودودی صاحب کا ایک فقرہ نقل کیا ہے کہ "کثرتِ مطالعہ اور ممارست سے انسان میں ایک ایسا ملکہ پیدا ہو جاتا ہے جس سے وہ رسول کا مزاج شناس ہو جاتا ہے"[1] یہ فقرہ میں نے بعض دیگر محدثوں کی تحریروں میں بھی دیکھا ہے اور یہ اسوقت انھوں نے کہا ہے جب اپنی پیش کی ہوئی حدیثوں کی صحت کی کوئی دلیل نہیں لا سکے۔ تعجب ہے کہ مودودی صاحب اس کے سمجھنے سے قاصر رہے۔ وہ دین ہی کیا ہوگا جس کا مدار کسی کے ذوقِ سخن شناسی پر رکھا جائے۔ یہ تو علم اور عقل سے گری ہوئی خالص شخصیت پرستی ہے۔

پھر اسی نمبر میں دوسری بحث یہ آگئی ہے کہ جو لوگ کسی منصب کے خواہاں ہوں ان کو وہ منصب نہ دیا جائے۔ یہ قول کسی خاص موقع پر کہا جا سکتا ہے لیکن یہ نہ کوئی اصول ہے نہ قرآن کی تعلیم۔ بلکہ خود قرآن تصریح کرتا ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے بادشاہ مصر سے درخواست کی تھی کہ "اجعلنی علیٰ خزائن الارض انی حفیظ علیم" (مجھے ملک کے خزانوں پر مقرر کر دو کیونکہ میں واقفکار محافظ ہوں) چنانچہ ان کو وزیر خزائن کا عہدہ دیا گیا۔ مولانا مودودی نے جس آیت سے اپنے دعوے پر استدلال کیا ہے وہ، جیسا کہ آپ نے لکھا ہے کھلی ہوئی تحریف ہے۔ والسلام (مورخہ ۱۴ دسمبر ۱۹۵۰ء)

---

[1] اشاعت رواں میں مقالہ "مثلہ معہ" میں اس ضمن میں مودودی صاحب کی تحریروں سے بہت سے اقتباسات آپ کی نظر سے گذریں گے جن سے معلوم ہوگا کہ انھوں نے دین کو کس طرح ایک شخص کے ذاتی ذوق کے سپرد کر رکھا ہے۔ (طلوع اسلام)

حافظ سید محب الحق صاحب مرحوم!

"ہم کہہ دیں گے کہ ہم کو قرآن ہی ملا اور وہی قرآن ہم لیکر آئے ہیں"۔

سفرِ آخرت کی تیاری ہو رہی ہے اور مسافر زادِ راہ تیار کر رہا ہے۔

خوش آں راہی کہ سامانے نہ گیرد

کے نشہ میں سرشار مسافر کی نگاہ میں دنیا کا کوئی سامان نہیں جچتا اور اس کی روح کی گہرائیوں سے آواز اٹھتی ہے:

حسبنا کتاب اللہ

وہ اپنے منتہا کو دیکھتا ہے، اسے یقین ہو چکا ہے کہ کوئی وقت جاتا ہے کہ اس کی آنکھ اس جہان آب و گل پر بند ہو جائے گی۔ اور اس عیشۃ راضیہ پر کھلے گی جس کا قرآن میں وعدہ کیا گیا ہے۔ اس کا نفس مطمئنہ اپنے آپ کو اپنے رب کے حضور میں محسوس کرتا ہے اور پورے یقین اور ایمان سے پکار اٹھتا ہے کہ

ہم کو قرآن ہی ملا اور وہی قرآن ہم لیکر آئے ہیں!

ڈاکٹر تھارانی روڈ پر حسن منزل (کراچی) میں ایک مردِ درویش رہا کرتے تھے۔ خوبصورت، نورانی چہرہ، سفید گھنی، کھلی داڑھی، نوے سال سے اوپر کا سن عمر کے تقاضے سے جسم مجموعۂ امراض بن چکا تھا۔ بصارت قریباً جواب دے چکی تھی، سماعت نہ ہونے کے برابر تھی۔ لیکن جسمانی عوارض کے باوجود ذہنی مستعدی اور قلبی حضور کا یہ عالم تھا کہ جو ارادت کیش مزاج پرسی کیلئے حاضر ہوتے ان کے مضطربانہ سوالات کے جواب میں نہایت اختصار سے یوں فرماتے کہ نیند بھی نہیں آئی، کچھ کھا بھی نہیں سکا، اختلاج بھی ہو گیا وغیرہ۔ لیکن اللہ کا فضل ہے۔ اور اس کے بعد سلسلہ کلام کچھ اس طرح شروع ہو جاتا کہ دیکھئے، ہم بیٹھے بیٹھے قرآن کے فلاں مقام پر یوں غور کر رہے تھے۔ اگر اس میں کچھ اشکال محسوس ہوتا تو بلا تکلف سامع کی رائے پوچھتے ورنہ اپنے خیال کا اظہار کرتے اور اس انداز سے گفتگو جاری رہتی کہ پرسانِ حال یہ سمجھتے کہ آپ کے مزاج بحمد اللہ بخیر ہیں۔

یہ تھے شمس العلماء حافظ سید محب الحق صاحب رئیس پٹنہ۔

آپ شاہو بیگہ، ضلع گیا (بہار) میں پیدا ہوئے۔ سن پیدائش قریباً ۱۸۵۵ء تھا چونکہ آپ کے والد بزرگوار سید فدا حسین صاحب

اسی گاؤں میں مقیم تھے اس لئے آپ کے بچپن کا زمانہ اسی گاؤں میں گذرا۔ ایک قاری محمد جان صاحب کو انھیں قرآن مجید حفظ کرانے کیلئے مقرر کیا گیا۔ قاری صاحب لکھنؤ کے رہنے والے تھے لیکن وہ تین سال تک ان کے پاس شاہوبیگہ میں رہے۔ قاری صاحب قرأت میں غیر معمولی شہرت رکھتے تھے، یہانتک کہ ان کے حسنِ قرأت کی وجہ سے مشہور تھا کہ ان کے پاس جن پڑھنے کیلئے آتے ہیں۔ وہ جب سید رضا حسین کے پاس آتے تو آتے ہی کہتے: ہاں بھئی حافظ صاحب سناؤ! جب ان کا شاگرد انھیں بے تکلف قرآن سنا دیتا تو فرطِ محبت سے ان کی آنکھوں سے آنسو رواں ہو جاتے۔ تین سال کے بعد جب آپ لکھنؤ واپس چلے گئے تو ایک نابینا حافظ فضل حسین صاحب حفظ قرآن پر مقرر کئے گئے۔ ان قاری صاحب کا حافظہ بلا کا تھا اور قرآن اس صحت اور روانی سے یاد تھا کہ جب بھی ان سے پوچھا جاتا کہ فلاں آیت کس مقام پر ہے تو نہایت بے تکلفی سے فوراً صحیح بتا دیا کرتے تھے۔

جب حافظ صاحب کی عمر کوئی ۲۳ یا ۲۴ برس کی ہوئی تو آپ عظیم آباد (پٹنہ) تشریف لے گئے۔ وہاں پر آپ نے عربی کی تعلیم حاصل کی۔ وہیں ایک بڑے رئیس مولوی منیر علی صاحب کی نواسی۔ . . . سے آپ کی شادی بھی ہوگئی تو آپ نے پٹنہ ہی میں مکان بنوا کر مستقل رہائش اختیار کر لی۔ تین چار سال میں ان کی بیگم کا انتقال ہوگیا۔ ان کے بطن سے ایک لڑکی پیدا ہوئی تھی وہ بھی فوت ہوگئی۔ آپ کے چچا سسر کا نام سید رضا حسین تھا جو وہاں کے "سرسید" مشہور تھے۔

آپ کی دوسری شادی سید عبدالعزیز صاحب کی ہمشیرہ سے ہوئی۔ سید عبدالعزیز صاحب پٹنہ کے مشہور لیڈر تھے اور مخدوم راستی کی اولاد میں سے تھے۔

اب حافظ صاحب کا رجحان تصوف کی طرف ہونا شروع ہوگیا۔ آپ کی عمر کوئی تیس برس کی ہوگی کہ ایک بزرگ حاجی خدا بخش صاحب جو کہ غازی پور کے رہنے والے تھے اور دہلی میں مقیم تھے، پٹنہ تشریف لائے۔ ایک دن اتفاقیہ حافظ صاحب کی ان سے ملاقات ہوگئی تو آپ نے دیکھا کہ لوگ آ آ کر حاجی صاحب سے قرآن کے مطالب پوچھتے ہیں۔ حافظ صاحب نے بھی عرض کیا کہ اگر آپ خدا کی راہ بتاتے ہیں تو میں بھی آپ کے پاس آیا ہوں۔

حاجی صاحب نے جواب دیا کہ اللہ کی راہ قرآن میں ہے اور تمہارے پاس قرآن موجود ہے"۔ حافظ صاحب فرماتے ہیں کہ "جب بھی ان سے کچھ پوچھا جاتا تو حاجی صاحب یہی جواب دیتے کہ تمہارے پاس قرآن موجود ہے"۔

حافظ صاحب پہلے ہی سے قرآن کی طرف راغب تھے۔ حاجی صاحب کے جواب سے ان کے رجحان کو اور تقویت ملی۔ آپ کے بیان کے مطابق ان کے پیر صاحب بیعت نہیں لیا کرتے تھے بلکہ صرف قرآن پڑھنے اور اس پر عمل کرنے کی تلقین فرمایا کرتے تھے۔ اس سے ان کا قرآن میں استغراق اسقدر زیادہ ہوگیا کہ بتدریج کسی اور کتاب کی طرف توجہ ہی نہ رہی، نوبت یہانتک پہنچ گئی کہ جب ۱۹۴۰ء میں محترم پرویز صاحب نے ان کی طرف خط لکھا اور ایک حوالہ دریافت کیا تو آپ نے جواب دیا:-

میں نے اپنی کل کتابیں حدیث و تفسیر سب ہی مدرسہ شمس الہدیٰ میں دے ڈالی تھیں اور صرف قرآن کو اپنا نصب العین بنایا تھا کہ بس قرآن ہی کافی ہے۔ . . . . . میری کل تصنیفوں کی بنیاد صرف قرآن پر ہے۔ . . . . . میرا سن انتہا کو پہنچا۔ اپنے حافظہ پر اعتماد نہیں رہا۔ کتابیں قرآن کے سوا کوئی میرے پاس نہیں۔ (۲۱ اگست ۱۹۴۰)

آپ کی سب سے اولیں تصنیف ایک رسالہ "میلاد النبیؐ" ہے۔ یہ ۹۲ صفحات کا رسالہ بہت مقبول ہوا اور کئی بار شائع ہوا۔ گو بعد میں آپ فرمایا کرتے تھے کہ "یہ میرے ایام جاہلیت کی تصنیف ہے"، تاہم اس کی بہت قدر کی گئی۔ یہ رسالہ حیدرآباد (دکن) میں بھی شائع ہوا تھا۔ پٹنہ کے ایک پادری ڈین صاحب نے، جن کے ذمہ ڈسٹرکٹ سکولوں کے لئے نصاب تعلیم کی کتابوں کا انتخاب تھا، دیکھ کر کہا:

ہم نے پیغمبر اسلام کے حالات بہت پڑھے لیکن اس جیسی کتاب نہیں دیکھی۔

سر علی امام پٹنہ کے مشہور بیرسٹر حافظ صاحب کے بہنوئی تھے۔ ایک مرتبہ انھوں نے آپ کو اپنے ہاں دعوت پر بلایا۔ دورانِ گفتگو میں کہنے لگے کہ اگر آپ اجازت دیں تو میں بے تکلف ہو کر آپ سے گفتگو کروں کیونکہ میں بعض سوالات کے تشفی بخش جواب چاہتا ہوں۔ آپ کے اجازت دینے پر سر علی امام کہنے لگے کہ قرآن مجید کی حقانیت کے لئے صرف اتنا ہی کہہ دینا کہ اس جیسی ایک سورت بنا لاؤ کچھ سمجھ میں نہیں آتا کیونکہ سعدی کی گلستاں اور ہومر کی کتاب اور اسی طرح کی کئی کتابیں ہیں کہ ان کے جواب کی کتابیں بھی آج تک کوئی شائع نہیں کر سکا۔ اور پھر قرآن میں کوئی تسلسل بھی نہیں۔ کہیں کچھ ہے، کہیں کچھ۔ حافظ صاحب نے اعتراض سنا اور بڑے تحمل سے جواب شروع کیا:

جیسا کہ خدا تعالیٰ کی مخلوق میں سلسلہ ہے، ویسے ہی اس کے کلام میں سلسلہ ہے، جو اس بات کا ثبوت ہے کہ قرآن خدا کا کلام ہے۔۔۔

حافظ صاحب نے ان اعتراضات کو سامنے رکھا اور ان کو پیش نظر رکھتے ہوئے اپنی پہلی کتاب "دعوت الحق" تصنیف کی۔ آپ نے جب یہ کتاب سر علی امام کو دکھائی تو انھوں نے اعتراف کیا کہ ان کے سب اعتراضات کا جواب مل گیا ہے۔ اس اثنا میں آپ مسوری تشریف لیگئے۔ وہاں آپ کے پاس کالج کے دو متعلم آنے لگے۔ ان کا میلان دہریت کی طرف تھا۔ دورانِ گفتگو میں وہ اعتراضات کرتے اور حافظ صاحب اُن کے جواب دیتے۔ یہ سلسلہ کئی دن تک جاری رہا۔ ایک دن آپ نے ان سے کہا کہ اس طرح تو تمہارے سوالات ختم نہیں ہوں گے، لو یہ کتاب میں نے لکھی ہے، اسے پڑھو۔ انھوں نے بھی جب دعوت الحق کا مطالعہ کیا تو اس میں اپنے جملہ اعتراضات کا تشفی بخش جواب پایا اور دہریت سے باز آگئے۔ اس کے بعد "دعوت الحق" کو شائع کر دیا گیا اور وہ بہت مقبول ہوئی۔ اس کتاب کی نظام دکن نے بھی بہت تعریف کی اور حافظ صاحب کا وظیفہ مقرر کر دیا۔ حافظ صاحب کے نظام دکن سے قریبی مراسم تھے، چنانچہ جب ملاقات ہوتی تھی تو متعدد مسائل پر گفتگو رہتی تھی۔ آپ جب بھی حیدرآباد جاتے ایک ایک دو دو ماہ قیام رہتا۔

حافظ صاحب کی تمام تصانیف اس وقت قریباً نایاب ہیں۔ ہمیں افسوس ہے کہ دعوت الحق ہمارے بھی پیش نظر نہیں۔

دعوت الحق کے کوئی دس برس بعد ۱۳۳۹ھ میں یعنی آج سے کوئی تیس برس پہلے شرعۃ الحق شائع ہوئی۔ اس سلسلہ کی تیسری کتاب منہاج الحق تھی جو کوئی چھ سال بعد یعنی ۱۳۴۵ھ میں شائع ہوئی۔ حافظ صاحب پرویز صاحب کے نام اپنے ایک مکتوب گرامی میں لکھتے ہیں:۔

> میں نے کتاب (یعنی شرعۃ الحق) لکھی، اس کو قریب قریب چالیس برس ہوئے ہوں گے۔ یہ کتاب جو علماء کے لئے ہے اور دوسری کتاب منہاج الحق جو صوفیہ کے لئے ہے، دونوں کتابیں دس برسوں تک لکھی لکھائی پڑی رہیں۔ میرا لڑکا بیرسٹری کے لئے ولایت گیا ہوا تھا، چھپوانے کا موقع نہ ملا اور پھر بھول چوک بھی۔ اتفاق سے میں حیدرآباد گیا۔ وہاں منہاج الحق سننے کو مجمع آتا رہا اور اس میں ہمارے دوست مولوی حمید الدین صاحب بھی آئے۔ فرمائش کر کے کچھ سنا اور کتاب میرے ہاتھ سے لے لیا۔ دیکھا تو ان کی نظر پڑی کہ اس کتاب کو صاف ہوئے دس برس ہو گئے۔ وہ مصر ہوئے کہ اس کو فوراً چھپنا چاہئے، ورنہ آپ مر جائیں گے اور کتاب ضائع ہو جائے گی۔ مسلمانوں کے بہت ذخیرے ضائع ہو چکے۔ انہوں نے اسی وقت کاتب کو بلا کے اس کے حوالہ کیا کہ فوراً کتاب چھپے۔ میں نے کہا کہ پروف کون دیکھے گا میں جا رہا ہوں۔ مولوی عبدالغنی مرحوم نے کہا کہ میں دیکھوں گا غرض احباب کی زبردستی سے وہ کتاب چھپی۔ (۱۴ر اگست ۱۹۴۰ء)

مولانا حمید الدین فراہی صاحب نے نہ محض مسودہ کاتب کو دلوایا بلکہ اپنی گرہ سے پچاس روپے بھی دیئے تاکہ کتاب کے چھپنے میں مزید رکاوٹ نہ ہو۔

محولہ بالا خط سے پتہ چلتا ہے کہ شرعۃ الحق اور منہاج الحق چالیس سال پہلے یعنی قریباً ۱۹۱۰ء کے لگ بھگ ضبطِ تحریر میں آئی تھیں۔ انیسویں صدی کا ورق الٹا جا رہا تھا۔ تاریخ کے اس نہ بھولنے والے ورق کی تحریر کا بیشتر حصہ خونِ مسلم کی سرخ روشنائی سے لکھا گیا تھا۔ اس صدی کے آخری حصہ نے ممالکِ اسلامیہ کو سکرات الموت تک پہنچا دیا۔ ہندوستان میں مسلمانوں کا سیاسی مرکز، نام نہاد مغلیہ سلطنت کی شکل میں جیسا کیسا باقی رہ گیا تھا وہ مٹ چکا تھا۔ عالم اسلامی کا مرکز خلافتِ عثمانیہ تھی، وہ بھی دم توڑ رہی تھی۔ اسے نیست و نابود کرنے کا فریضہ انیسوی صدی نے بیسویں صدی کے سپرد کیا۔ بیسویں صدی نے اس سرعت اور مستعدی سے اس سے سبکدوشی حاصل کی کہ اسے انیسویں کا ہی کارنامہ کہا جا سکتا ہے۔ ان پیہم صدمات سے مسلمانانِ عالم پر ہمہ گیر اضمحلال چھا گیا تھا۔ سیاسی شکستوں کے جلو میں ان کے علمی مراکز ختم ہو چکے تھے۔ اب ان کے پاس نہ حکومت تھی، نہ دولت، نہ علم، شکم خالی، قلب مردہ، دماغ تاریک، حال پریشاں، مستقبل پریشان تر۔ عالم اسلامی پر عمومی جمود تھا۔ کیا اس سین پر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے پردہ گر جائے گا؟ یا تاریخ ملت ابھی سنبھالا لیگی؟ یہ سنبھالا امر محال نظر آتا تھا۔ مسلمان سیاسی شکست سے ہی ہم کنار نہیں ہوئے تھے، وہ روحِ زماں کی رفاقت سے محروم ہو چکے تھے۔ وہ اپنے آپ کو ان قویٰ سے ہم آہنگ نہ کر سکے تھے جنہیں انیسویں صدی نے جنم دیا تھا۔ یہ صدی

سائنسی ایجادات کے اعتبار سے بے مثال ہے۔ تاریخ انسانی میں پہلی مرتبہ انسان نے قوائے فطرت کو مسخر کرنے کا راز دریافت کیا اور آثار پیدا ہوئے کہ ہر چند کائنات لامتناہی ہے اور علی قدر تناسب انسان ذرہ ناچیز ہے، لیکن وہ رموز فطرت کی عقدہ کشائی کر کے ایک زندہ فعال اور ہدایت کار عامل بن سکتا ہے۔ انسان کا شعور خودی بیدار ہو رہا تھا۔ اس انقلاب عظیم میں انسانوں کے وہ گروہ جو بدستور ماضی میں رہ رہے تھے ماضی ہی کی آغوش میں رہ گئے۔

ہر چند ان زلزلوں سے کوہ و دشت سحاب کی مانند اڑتے دکھائی دے رہے تھے، لیکن تہ سے کچھ تازہ چشمے بھی ابلتے نظر آ رہے تھے۔ ہندوستان میں سرسید للکارا کہ یہ شکست و ریخت تعمیر نو کی نوید ہے۔ انیسویں صدی کی قوت تعمیر کا یہ پیکر تخریب و تعمیر کے دیرینہ روابط کا اندازہ کر کے اٹھ کھڑا ہوا۔ ضرورت نئی زمانی قوتوں سے ہم آہنگ ہونے کی تھی۔ لیکن نظر بہ ظاہر ان نئی قوتوں نے تو مسلمانوں کو پامال کیا تھا وہ اس سے کیسے ہم آہنگی کر سکتے تھے؟ نہیں، یہ ہم آہنگی ان اصول و قوانین سے ہونی تھی، تخریبی قوتیں جن کا ہنگامی مظہر تھیں۔ سرسید ایک ہی سہارا لے سکتا تھا اور اس کا وجدان اسے وہیں لے گیا۔ اس نے گرد آلود غلاف سے قرآن کو نکالا اور اس کا ایک ایک صفحہ کھول کر مسلمانوں کو دکھایا اور انہیں بتایا کہ اس کے ایک ایک لفظ میں زندگی کے کس قدر راز پوشیدہ ہیں۔ قرآن صدیوں سے مسلمان کے پاس تھا اور ہر وقت ان کے پاس رہا۔ کیا وہ واقعی انقلاب انگیز کتاب تھی؟ کیا وہ حیاتِ انسانی کے اس اہم موڑ پر واقعی راہنمائی کر سکنے کی اہلیت رکھتی تھی؟ بے دین یورپ کے بڑھتے ہوئے سیلاب شوکت کے سامنے خس و خاشاک کی طرح بہنے والا مسلمان یہ کیسے یقین کر سکتا تھا؟

مسلمان صدیوں سے قرآن کو پسِ پشت ڈال چکے تھے۔ اب وہ بظاہر قرآن کا نام لیتے تھے اور درحقیقت احادیث و روایات مراد لیتے تھے۔ احادیث نہ محض اساسِ دین بن چکی تھیں بلکہ وہ قرآن پر قاضی اور اس کی ناسخ قرار پا چکی تھیں۔ یہ عقیدہ اس قدر راسخ اور یہ ذہنیت اس قدر متشدد ہو چکی تھی کہ کسی کے ذہن میں خیال تک نہیں آ سکتا تھا کہ دین کی اساس تنہا قرآن پر رکھی جا سکتی ہے۔ مسلمان نہ محض ماضی ہی کو روایات کی عینک سے دیکھتے تھے بلکہ حال و مستقبل کو بھی اسی میزان میں تولتے تھے۔ ان کیلئے سب کچھ مقدر ہو چکا تھا جس پر "شکر" اور "صبر" کرنا چاہیئے۔ فکر سے عاری اور عمل سے بیگانہ ہو کر قومیں مات کھا جاتی ہیں اور یہی مسلمانوں کے ساتھ ہوا۔ وہ اسی خوش فہمی میں مبتلا رہا جس میں کبھی بنی اسرائیل رہ چکے تھے کہ لن تمسنا النار الا ایاما معدودۃ۔ یہ زندگی چند روزہ ہے، دوسری حیاتِ جاوید دائمی جنت میں گزرے گی۔ انہیں جھنجوڑنے اور حقائق زندگی سے متعارف کرانے کیلئے ضروری تھا کہ انہیں قرآن کی طرف دعوت دی جاتی، لیکن قرآن روایات کی بے شمار تہوں میں لپٹا ہوا تھا۔ کیا ان "مقدس" تہوں کا تار و پود بکھر سکتا تھا؟ موج حیات بڑھ کر جب جوئے تند و تیز ہونے پر آئی تو پھر اس کی روانی اور جولانی کو کون روک سکتا تھا!

حافظ محب الحق اسی جذب اندروں کے مظہر تھے۔ آپ روایات کی پُر پیچ و تار راہوں سے گزرتے ہوئے قرآن کے چشمۂ حیواں

تک پہنچے اور دل کھول کر مسلمان کی تشنگی کا سامان بہم پہنچایا۔ آپ شرعۃ الحق کے ذیلی عنوان میں لکھتے ہیں:

جس میں شریعت حقہ صرف قرآن مجید کی صریح آیتوں سے بیان کی گئی ہے اور یہ ثابت کر دیا گیا ہے کہ قرآن مجید مکمل اور مفصل ہے اور یہ بھی کہ خدائی کتاب انسانی رائے کی پابند و ماتحت نہیں ہے اور یہ بکمالہ اکملت لکم دینکم واتممت علیکم نعمتی کا مظہر کامل ہے۔

غرض تصنیف بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

ان دونوں کتابوں (شرعۃ الحق اور منہاج الحق) کا مخرج قرآن مجید ہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ مجھے قرآن مجید ہی سے سمجھانا ہے اور میں سمجھاؤں گا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ میں جانتا ہوں کہ قوم حق بینی کی نگاہ نہ ڈالے گی۔ ۔ ۔ ۔ ۔ وہ قرآن مجید کے مقابلہ میں بھی اپنی آبائی روش کی جانداد ہو کر کہ ما الفینا علیہ اباءنا مجھے برا بھلا سخت و سست کہنے کو کھڑی ہو جائے گی، مگر مجھے برا بھلا کہہ کر کیا پائے گی۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ قوم (مجھے) جاہل کہے گی، ای محض کہے گی، تو کچھ بے جا اور برا نہ کہے گی۔ ۔ ۔ ۔ اس کا یہ کہنا صحیح ہوگا، مگر اس کا یہ خیال صحیح نہ ہوگا کہ ایک جاہل اور امی نور حق کا مورد اور حق گو نہیں ہو سکتا۔ مجھے جو کچھ بھی وہ کہے حق ہو سکتا ہے، مگر اس کا حق سے منہ موڑنا کبھی حق نہیں ہو سکتا۔ اگر وہ مجھے دیکھے گی تو ٹھوکریں کھائیگی اور اگر وہ حق کے آگے سر جھکائیگی تو نجات پائے گی۔

اس کتاب میں کئی مباحث ہیں، چند عنوانات سے کتاب کی نوعیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

۱) خداوند عالم نے سارے رسولوں کے ذریعہ ایک ہی صراط مستقیم کی ہدایت کی۔

۲) کیا ہر دین ماسبق دین کا ناسخ ہے یا مصدق؟

۳) کیا قرآن کی آیات ایک دوسرے کی ناسخ ہیں؟

۴) دین الٰہی میں حکم خداوندی واجب التعمیل ہے یا کسی اور کا بھی؟

۵) اگر اطاعت قرآن مجید کی فرض ہے تو اطاعت رسولؐ کے کیا معنی؟

۶) قرآن مجمل ہے یا مفصل، کامل ہے یا ناقص؟ محتاج تفسیر ہے یا نہیں؟

۷) قرآن، تفسیر، حدیث، فقہ کی باہمی منزلتیں۔

اطاعت رسول کے معنی بیان کرتے ہوئے آپ اس عام عقیدہ کو زیر بحث لاتے ہیں کہ حدیث جزو دین ہے، اور لکھتے ہیں:

اگر اطیعوا الرسول کے یہ معنی ہوں تو خود آنحضرت صلعم پر جو ہم پر ماں باپ سے زیادہ شفیق تھے، اپنے کل اقوال و افعال کو قرآن مجید کی طرح لکھوا جانا اور بذریعہ حفاظ اشاعت کرنا لازم ہو جائے گا تاکہ آپ کی امت اطیعوا الرسول کی نافرمان نہ ہو سکے۔

اگر قرطاس و قلم کے لئے طلب فرماتے ہوں اور لکھوا نہ سکے، تو صحابہ، خلفاء، اہل بیت اور کل مخلصین مسلمانوں کو فتوحات سے بڑھ کر ضروری اور لازم تھا کہ آپ کے اقوال و افعال کو جمع کر لیں اور آپ کے حرکات و سکنات کو قلم بند کر لیں . . . . تاکہ خود بھی اور سارے مسلمان بھی اطیعوا الرسول کے نافرمان نہ بن سکیں۔ مگر کسی نے جمع نہ کیا۔ اگر اطیعوا الرسول کے یہی معنی ہیں تو اس کا کوئی مطیع نہیں ملے گا، کیونکہ آپ کی مقدس زندگی کے سارے اقوال و افعال اور حرکات و سکنات نہ پہلے کسی کو پہنچے ہوئے تھے اور نہ اب پہنچے ہوئے ہیں۔ تو پھر اطاعت رسول کس نے کی اور کون کر سکتا ہے؟ اگر اطاعتِ رسول کے یہ معنی ہوتے جو لوگ سمجھتے ہیں تو صحابہ اس سوال میں بے باک نہ ہوتے کہ یا رسول اللہؐ حکم آپ کا ہے یا خدا کا۔ اور ایسے حال میں حضرت زید رضی اللہ عنہ کبھی زینبؓ کو طلاق نہ دیتے درآنحالیکہ نبی فرما رہے تھے امسك عليك زوجك۔ اپنی بیوی کو طلاق نہ دو۔

لہٰذا

اطاعت سے مراد رسالت یعنی قرآن کے ہیں۔ یہی اطاعت خدا کے بھیجے ہوئے اور رسولؐ کے لائے ہوئے قرآن کی ہے، اور یہی ایک اطاعت دونوں کی اطاعت ہے۔ من يطع الرسول فقد اطاع الله۔

حافظ صاحب کی علمی تحقیقات اور تصنیفی مساعی کا نکتہ ماسکہ قرآن تھا۔ آپ نے جو کچھ لکھا وہ اپنی فہم کے مطابق قرآن ہی سے اخذ کیا۔ وہ اس مقصد کا اتنا قوی احساس رکھتے ہیں کہ قدم قدم پر قارئین کو یاد دلاتے ہیں۔ وہ قرآن میں کسی قسم کی آمیزش کے روادار نہیں۔ چنانچہ ایک بحث کے خاتمہ پر لکھتے ہیں،

چونکہ یہ میری تحقیق ہے، یعنی ایک انسانی تحقیق ہے جس میں غلطی ہو سکتی ہے، تو اس کی تحقیق مصطلحات سے، محاورات عرب سے، مذہبی تاریخ یعنی حدیث سے، یا اعمال قوم سے جس طرح چاہو کر سکتے ہو۔ مگر وہ ماخذ اساد کی جگہ ہماری جہالت اور لاعلمی دور کرنے والے ہو سکتے ہیں، داخل دین ہو کر دین اللہ نہیں ہو سکتے، نہ قرآن مجید کی قطعیت چھین سکتے ہیں . . . . اگر میری تحقیق سے اتفاق نہ ہو تو آپ تحقیق کرو . . . تحقیق کو میں منع نہیں کرتا . . . . مگر خدا کیلئے قرآن کو مجمل نہ کہو کہ یہ قرآن مجید کے خلاف ہے۔

کتاب کے خاتمہ پر مختصر سی مناجات ہے۔ عام مسلمانوں کیلئے معافی اور بخشش طلب کرنے کے بعد اپنے متعلق کہتے ہیں:

اے خدا! میری ازلی تمنا ہے کہ پرسشِ اعمال کے دن ہمارا نامۂ اعمال قرآن مجید ہی نکلے، اس کی شریعت کامل بھی اور اس کی روحانیت اتم بھی۔ اپنی بساط سے باہر آندھی لیکر آیا ہوں، لیکن اے خدا، مجھے نہ دیکھ، اپنے کو دیکھ، تو وہ کر جو تیری خدائی کے شایاں ہو، اور تیری عظمت و جلالت کے سزاوار . . . . تاکہ رسول معصوم صلی اللہ علیہ وسلم کی فریاد میں میرا

نام نہ ہو جس وقت خود برولت کی یہ فریاد ہوگی: وقال الرسول یارب ان قومی اتخذوا ھذا القرآن مھجورا۔

قرآن کی طرف یہ بے باک دعوت اور قرآن اور حدیث کے باہمی تعلق کا یوں صاف صاف اور ٹھیک ٹھیک تعین مذہبی حلقوں میں تہلکہ مچا دینے کے لئے کافی تھا۔ حیدرآباد (دکن) کے 'مذہبی' امور کے افسر اعلیٰ ان دنوں حبیب الرحمٰن شیروانی تھے۔ انھوں نے اس کتاب کو گمراہی پھیلانے والی کتاب قرار دیا اور حیدرآباد سے حافظ صاحب کو جو وظیفہ ملتا تھا وہ بند کرا دیا۔ نیز انھوں نے کسی مولوی صاحب سے کچھ اعتراضات لکھوائے اور حافظ صاحب کی طرف بھجوائے کہ وہ ان کا جواب دیں۔ حافظ صاحب نے انھیں لکھا کہ

آپ ایک جلسہ قائم کر کے علماء کو بلالیں تو میں ان سے اس پر بحث کرنے کیلئے تیار ہوں مگر اسی شرط پر کہ قرآن سے اعراض نہ ہو۔

کون مولوی اس شرط کو منظور کر سکتا تھا! خیر نظام نے حافظ صاحب کا موقوف شدہ وظیفہ از سر نو جاری کر دیا۔

خود حافظ صاحب نے اس مخالفت کی طرف اس انداز سے اشارہ کیا ہے جو متانت اور لطافت کا حسین امتزاج ہے۔ اپنی آخری کتاب "بلاغ الحق" میں "عرض حال" کے تحت لکھتے ہیں:

اس کا لازمی نتیجہ تھا کہ شاخسانے کھڑے کئے جائیں، وہ کھڑے کئے گئے۔ کسی کسی نے الٹ پلٹ کر کچھ دیکھا بھی تو بُری نگاہ سے۔ کسی نے کہا کہ یہ اہل قرآن ہو گئے۔ قرآن ہی سے لکھتے ہیں، حدیث سے نہیں، اقوال علماء سے نہیں، تو ان کے کفر میں کیا کلام رہا۔ کسی نے کہا کہ منہاج الحق میں رقص مستانہ اور رسوم خانوادہ کی حمایت نہیں ملتی تو ان کے منکر خانقاہ اور کافر ہونے میں کونسی تامل کی جگہ باقی رہی۔ . . . . . کسی نے کہا کہ جس گھر میں یہ کتاب رہے وہ کافر کا گھر ہے۔ پوچھا گیا کہ آپ نے پڑھی بھی، فرمانے لگے پڑھی تو نہیں، اور پڑھنے کی ضرورت بھی نہیں۔ کہنے والوں نے کہا، سننے والوں نے سنا۔ جو میں نے سنا وہ اک معتبر حضرت سے سنا ہے جو میرے عقیدہ میں ثقہ ہے۔

روایت پرستوں کے نزدیک کسی روایت کی صحت کا دارومدار مفروضہ راوی کی مزعومہ ثقاہت پر ہے۔ ثقاہت کا کوئی مطلق معیار نہیں۔ چنانچہ حافظ صاحب آگے چل کر لکھتے ہیں:

جیسے کسی کے مرنے کی خبر مشہور ہوئی۔ ملاقات میں ان کے دوست نے پوچھا کہ بھئی میں نے تمہارے مرنے کی خبر سنی، سخت صدمہ ہوا۔ وہ فرمانے لگے کہ بالکل غلط ہے، دیکھ لو میں مجسم موجود ہوں۔ ان کے دوست نے کہا کہ میں نے ایک مولوی صاحب سے سنا اور وہ آپ سے زیادہ ثقہ ہیں۔

اب ایک "ثقہ" مولوی صاحب کی روایت کے مقابلہ میں متعلقہ شخص کا مجسم موجود ہونا اس بات کا کیسے ثبوت ہو سکتا ہے کہ مولوی صاحب کی روایت غلط ہے اور وہ مرنہیں گیا! لہٰذا ثابت ہوا کہ وہ شخص جو اپنے مرنے کی خبر کی خود تردید کر رہا ہے کذاب ہے!

"بلاغ الحق" حافظ صاحب کی آخری کتاب ہے۔ کتاب میں کہیں سن اشاعت نہیں دیا گیا۔ اس کتاب میں حدیث کی ظنیت کے

مقابلہ میں قرآن کی قطعیت ثابت کی گئی ہے اور عبادات اور معاملات پر بھی کافی بحث کی گئی ہے۔ اس کتاب میں ان کے دلائل میں پختگی آگئی ہے اور ان کا قرآن کی قطعیت پر ایمان مستحکم تر اور متشدد تر ہو گیا ہے۔ لیکن آپ کے انداز تحریر میں اس قدر توازن ہے کہ باوجود شدتِ تاثر کہیں جادۂ اعتدال سے منحرف نہیں ہوتے۔ مخالفین کی ایک ایک دلیل کو قرآن ۔۔ اور خود حدیث ۔۔۔ سے رد کرتے ہیں اور کسی بحث کو تشنہ نہیں چھوڑتے۔ وہ مخالفین کی مخالفت سے بالکل برہم نہیں ہوتے اور بدلائل ان کا جواب دیتے ہیں۔ اپنے متعلق ان کا ہمیشہ یہی دعویٰ ہے کہ میں نے قرآن اور صرف قرآن پیش کیا ہے۔ قارئین کو مصنف سے اختلاف ہو سکتا ہے لیکن قرآن سے تو نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا وہ ہر ایک کو یہی مشورہ دیتے ہیں کہ مجھ پر نکتہ چینی کرو، میری عیب جوئی کرو، لیکن قرآن کو نہ ٹھکراؤ۔ خود اس میں تفکر اور تدبر سے کام لو اور مجھے نظر انداز کر دو۔

حافظ صاحب کی صحت بہ تقاضائے عمر برسوں سے خراب چلی آ رہی تھی۔ ۱۰ ستمبر ۱۹۴۳ء کے تحریر کردہ خط میں آپ نے پرویز صاحب کو لکھا،

> اس ناسازیٔ طبع نے یہ سمجھا دیا کہ اب تصنیف یا تحریر کا وقت گذر گیا۔ کچھ لکھنا چاہتا تھا مگر ضعف سے سر میں چکر، ایسے حال میں کیا لکھوں۔ بیاسی برس کا سن ہوا، قوی جواب دے رہے ہیں۔ دوا کیا کام کریگی۔ سوکھے درخت میں پانی ڈالنے سے کچھ نہیں ہوگا
>
> غالب خوب کہہ گیا ہے۔

دم واپسیں برسرِ راہ ہے عزیزو اب اللہ ہی اللہ ہے

اس کے باوجود آپ نے طلوعِ اسلام کی طرف ایک تحریر بھیجی جسے آپ نے بخار اور بخار کے ضعف کے باوجود لکھا لیکن آپ میں نظرِ ثانی کی ہمت نہ تھی۔ اس سے پیشتر ایک خط میں جو ۱۴ اگست ۱۹۴۹ء کا لکھا ہوا ہے، آپ نے اپنی جسمانی کیفیت کو مجملاً بیان کیا اور اپنے آپ کو "مردہ نما زندہ" کہا لیکن اندرونی کیفیت اس پر بھی یہ تھی کہ

> ہمت کہتی ہے کہ چل، پیری کہتی ہے کہ اب وہ دن گئے، پیچھے نہ دیکھو، آگے دیکھو۔

ان کی ہمت پیری سے برسرِ پیکار رہی اور آخر دم تک ان کا ساتھ دیا۔

تقسیم ہند کے بعد آپ پاکستان تشریف لے آئے اور وفات تک یہیں کراچی میں مقیم رہے اور بالآخر یہیں مدفون ہوئے۔ ان کے معتقدین ان کی خدمت میں حاضر ہوتے اور گفتگو ہمیشہ قرآن ہی سے متعلق ہوتی۔ آپ نے جب پرویز صاحب سے سنا کہ معارف القرآن (جلد چہارم) کا مسودہ تیار ہو چکا ہے اور عنقریب شائع ہو جائے گا تو آپ نے فرمایا کہ اب میں اللہ میاں کے ہاں سے Extension (عمر میں توسیع) پر ہوں۔ پہلے درخواست کی تھی کہ معارف القرآن کی دوسری اور تیسری جلد دیکھ لوں، وہ منظور ہو گئی تو اب جلد چہارم تک کی توسیع کے لئے پھر گذارش کی ہے۔ لہٰذا اس کی تکمیلِ طباعت میں جلدی کرو۔ میری بینائی کا تھوڑا سا حصہ جو باقی رہ گیا ہے اسے میں نے

اس کتاب کیلئے محفوظ رکھ چھوڑا ہے۔ اللہ نے ان کی یہ درخواست بھی منظور کرلی اور انھوں نے اپنی زندگی کے آخری ایام معراج انسانیت کا ایک ایک لفظ پڑھنے میں صرف فرمائے۔

۱۹۴۱ء میں جب معارف القرآن کی پہلی جلد شائع ہوئی اور پرویز صاحب نے ایک نسخہ آپ کی خدمت میں روانہ کیا تو آپ نے رسید کے خط میں تحریر فرمایا:

> جانک کتاب کو دیکھا اس سے تو معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح عکسی قرآن چھپنا شروع ہوا ہے، آپ نے میری عقیدت اور خیالات کا عکسی مرقع شائع فرمایا ہے۔ اس قدر اتحادِ خیالات بھی کیا حیرت انگیز نہیں ہے۔ اب ان کی تعریف کرنا اپنی تعریف کرنا ہے۔ اور لا تزکوا انفسکم کے احاطہ کے اندر ممنوع ہے۔ (۲۶ ستمبر ۱۹۴۱)

کراچی میں پرویز صاحب اور ادارہ طلوعِ اسلام کے اراکین سے ملاقات میں آپ نے ایک مرتبہ فرمایا کہ میں نے جب دعوت الی القرآن کی ابتدا کی ہے تو ہمیشہ یہ خیال دامنگیر رہا کرتا تھا کہ نہ معلوم یہ آواز یہیں ختم ہو جائے گی یا اس دیئے سے آگے دیا بھی جلے گا۔ اللہ نے میری آواز سُن لی میری زندگی ہی میں یہ دعوت عام بھی ہوئی اور (پرویز صاحب کی طرف دیکھ کر مسکرا کر فرمایا) اب اس کی قلبی تسلی ہو گئی کہ یہ سلسلہ جاری رہے گا۔ اب میں اطمینان کی موت مروں گا۔

گذشتہ صدی کے آخر میں جب اس مردِ مومن نے رجعت الی القرآن کی دعوت دی ہوگی تو اس وقت یہ دعوت کس قدر غیر مانوس اور ناآشنائے گوش ثابت ہوئی ہوگی، اور آج اس مردِ مومن کی مسرتوں کا کیا ٹھکانہ ہوگا جس نے اپنی دعوت کو اپنی زندگی میں یوں عام دیکھ لیا۔ کتنی کامیاب ہے یہ زندگی اور کتنی قابلِ رشک ہے یہ موت!

حافظ صاحب کی صحت برسوں سے خراب تھی۔ کراچی میں ان کی حالت اور خراب ہو گئی۔ وہ چلنے پھرنے سے معذور تھے۔ اس کے باوجود ۱۹ جون ۱۹۴۹ء کی صبح کو آپ بہ محنت پرویز صاحب کے مکان پر تشریف لے گئے۔ بقول پرویز صاحب ان کا ظلمتکدہ قرآن کے نور سے وادیٔ ایمن بن گیا۔ پرویز صاحب نے جب اس زحمت کی وجہ دریافت کی اور کہا کہ مجھے اطلاع دی ہوتی تو میں خود حاضر ہو جاتا۔ تو اس پر آپ نے فرمایا کہ کئی دنوں سے یہ کھٹک پیدا ہو رہی تھی کہ ایک خادمِ قرآن کے پاس چل کر جانے کے ثواب سے کہیں محروم ہی نہ رہ جاؤں۔ آج یہ آرزو پوری ہو گئی۔

یہ کیفیت اسی مردِ مومن کی ہو سکتی ہے جس کی عمر قرآن میں تدبر اور اس کی تبلیغ میں گزری ہو اور اس کی زندہ تفسیر کہ قل ان صلاتی ونسکی ومحیای ومماتی للہ رب العالمین۔

گذشتہ سال طلوعِ اسلام میں "اسباب زوالِ امت" سے متعلق سلسلہ گفتگو کا آغاز ہوا تو موضوع کی اہمیت کے پیشِ نظر حافظ صاحب نے بھی اس بحث میں حصہ لیا اور اپنے گراں قدر خیالات پیش کئے۔ ان کا مضمون اگست ۱۹۴۹ء کے طلوعِ اسلام میں

شائع ہوا۔ آپ نے یہ مضمون اس طرح تحریر فرمایا کہ ضعفِ بصارت کے باعث اپنے لکھے کو پڑھ نہیں سکتے تھے۔ کاغذ اور قلم لیکر لکھنا شروع کر دیا اور بلا دیکھے اپنے خیالات تحریر فرماتے چلے گئے۔

مسلسل عوارض کبر سنی اور تقسیم ہند کے ضمنی عواقب کی وجہ سے حافظ صاحب مغفور روز بروز کمزور ہوتے چلے جا رہے تھے۔ شروع مئی (۱۹۵۰ء) میں وہ لاہور تشریف لے جانے پر آمادہ ہو گئے کیونکہ خیال یہ تھا کہ وہاں کی آب و ہوا ان کی صحت پر اچھا اثر کرے گی۔ ان سے جب لاہور کا ذکر آتا تو فرماتے کہ وہاں عرشی صاحب کی قرآنی جماعت ہے، ان سے قرآن پر باتیں ہوا کریں گی۔ ۲۰ مئی کو روانگی کا خیال تھا اور تیاریاں ہو رہی تھیں کہ ان کی طبیعت زیادہ خراب ہو گئی اور پھر سنبھل نہ سکی۔ چنانچہ ۲۵۔ ۲۶ مئی ۱۹۵۰ء کی درمیانی شب کو رحلت فرما گئے۔ فھو فی عیشۃ الراضیہ۔

آپ کے پانچ صاحبزادے ہیں۔

۱۔ سید محمد صاحب بیرسٹر

۲۔ سید محمود صاحب انجینئر

۳۔ سید مصطفیٰ صاحب الیکٹرک انجینئر

۴۔ سید حامد صاحب

۵۔ سید حبیب الحق صاحب

حافظ صاحب کے استغراق فی القرآن کا اندازہ کچھ وہی لوگ لگا سکتے ہیں جنھوں نے ان کی تصانیف کا مطالعہ کیا ہے یا وہ خوش نصیب جنھیں ان سے شرف ملاقات حاصل ہوا ہے۔ ہر چند حافظ صاحب کی عمر انیسویں اور بیسویں دونوں صدیوں پر برابر کی تقسیم ہو گئی تھی بلکہ ایک لحاظ سے انھوں نے بیسویں صدی کو کہیں زیادہ دیکھا کیونکہ ذہنی پختگی کا زیادہ حصہ اسی صدی میں گزرا لیکن وہ درحقیقت انیسویں صدی ہی کے مظہر اور نمائندہ تھے۔ انیسویں صدی میں حافظ صاحب ہراول تھے اس عظیم تحریک (رجعت الی القرآن) کے جو بیسویں صدی میں مسلمانوں کے فکری انقلاب کا باعث بنی۔

ہمیں افسوس ہے کہ حافظ صاحب کے حالاتِ زندگی زیادہ تفصیل سے مہیا نہیں کئے جا سکے۔ اس کے ذمہ دار آپ خود ہیں۔ آخری ایام میں ملک غلام کبریا صاحب (امت سلمہ والے) ان کی خدمت میں حاضر ہوئے اور چیدہ چیدہ واقعاتِ زندگی لکھوانے

کے لئے اصرار کیا تو آپ نے فرمایا کہ یہ ایک قصۂ پارینہ ہے۔ ایک گنہگار انسان ہوں اور ابھی تک جیتا ہوں، اور تمہارے سامنے ہوں، دیکھ لو۔ لکھنے کی کیا ضرورت ہے۔ حافظ صاحب نے اس قصہ پارینہ کی کڑیاں قصداً گم کیں۔ مثلاً ایک مرتبہ آپ نے اپنے صاحبزادوں کو بلایا اور ان سے کہا کہ میرے جو خطوط تمہارے پاس ہیں وہ لے آؤ۔ جب سب خطوط ان کی خدمت میں پیش کر دیئے گئے تو آپ نے ایک ایک کر کے ان کو تلف کر دیا۔ ان خطوط سے ان کے متعلق بیش قیمت معلومات ملسکتی تھیں لیکن انھوں نے ان کا نشان تک باقی نہ چھوڑا۔ یہ چند واقعات جو پیش کئے گئے بہت حد تک ملک غلام کبریا صاحب نے جمع کئے۔

سطور بالا سے شمس العلماء سید حافظ محب الحق صاحب کی عظمت کا کچھ اندازہ لگایا جا سکتا ہے اور یہ بھی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ان کے اٹھ جانے سے ملت کتنی عظیم شخصیت کے فیض سے محروم ہو گئی ہے۔ اس بدبخت ملت کو اس محرومی اور زیاں کا کتنا احساس ہے؟ اس کا اندازہ اس سے لگائیے کہ آپ کی وفات کی اطلاع پاکستان تو درکنار کراچی تک کے کسی ایک اخبار میں شائع نہیں ہوئی۔ ان کے لواحقین نے ایک مقامی اخبار کے دفتر میں جا کر یہ اطلاع دی تو اس نے اس کی اشاعت کو غیر ضروری سمجھ کر نظر انداز کر دیا۔ اس دور میں اصحاب علم کو کون پوچھتا ہے؟ ملت کو ان کی احتیاج نہیں! یہ چند سطور لکھ کر حافظ صاحب کا ذکر اس لئے کر دیا گیا ہے کہ آئندہ نسلیں اگر زندگی کی اساس قرآن کو بنائیں تو وہ داعیان الی القرآن کے مبارک سلسلہ کی مختلف کڑیوں سے ناواقف نہ ہوں!

مجلس دستور ساز پاکستان
نے دستورِ پاکستان کے سلسلہ میں
۳۱ر جنوری ۱۹۵۱ء تک تجاویز طلب کی ہیں۔
طلوع اسلام نے

نومبر ۱۹۵۰ء کے پرچے میں قرارداد مقاصد کا مسودہ پیش کیا چنانچہ اب ادارۂ طلوع اسلام دستور کے اساسی اصولوں کا قرآنی خاکہ تیار کر رہا ہے جو مقررہ تاریخ سے پیشتر مجلس دستور ساز میں پیش کر دیا جائے گا۔ یہ دستوری خاکہ فروری کے پرچہ میں شائع کیا جائے گا۔ انشاء اللہ۔ قارئین کرام سے درخواست ہے کہ وہ اپنے پرچے ابھی سے محفوظ کرالیں۔ ایجنٹ حضرات بھی اپنی فرمائشیں جلد بھیجیں ورنہ بعد میں تعمیلِ فرمائش شاید ممکن نہ ہو۔

ناظم ادارہ طلوع اسلام

دستورِ پاکستان

نومبر کی اشاعت میں دستورِ پاکستان کے سلسلے میں جو کچھ شائع کیا گیا تھا اس ضمن میں بعض احباب نے کچھ مشورے دیئے ہیں۔ (جن کے لئے ہم ان کے شکرگزار ہیں) اور بعض نے چند نکات کی وضاحت چاہی ہے۔ ان میں سے جو امورِ عام افادی حیثیت رکھتے ہیں انھیں درج ذیل کیا جاتا ہے تاکہ قارئین طلوعِ اسلام کے سامنے مسئلہ کی پوری صورت آتی چلی جائے۔

محترم سید جعفر صاحب پھلواروی تحریر فرماتے ہیں:

نومبر ۵۰ء کا طلوعِ اسلام دیکھا۔ "دستورِ پاکستان" کے عنوان سے از ۹ تا ۳۷ جو مقالہ آپ نے سپردِ قلم فرمایا ہے اسے دوبارہ پڑھا۔ میں نے اس نیت سے پڑھا کہ اس پر کچھ معقول اعتراضات پیش کروں لیکن مجھے افسوس ہے کہ میں اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو سکا اور اپنی ناکامی کا اعتراف کرتا ہوں۔ آپ کا مسودۂ قراردادِ مقاصد حکومت کے منظور کردہ قراردادِ مقاصد سے بہر حال بہتر ہے۔ آپ نے اپنا مسودہ ایک لحاظ سے بعد از وقت پیش کیا ہے اور دوسرے لحاظ سے بہت قبل از وقت ہے، یعنی قوم کو اس مقام تک —— جہاں نظامِ زندگی کی بنیاد خالص قرآن پر رکھی جائے اور روایات و اجتہادات سے بطور مؤیدات و نظائر کام لیا جائے —— پہنچنے میں بڑی دیر ہے اور اس کے لئے ایک مسلسل، نہ فقط مسلسل بلکہ مسلسل و منظم جد و جہد درکار ہے۔ آپ کے پاس اپنی ذاتی انتھک سعی موجود ہے لیکن کوئی "منظم پارٹی" نہیں جو اس "قولِ ثقیل" کو جاری رکھ سکے۔

قراردادِ مقاصد کے متعلق چند باتیں وضاحت طلب ہیں:

(۱) ص ۲۹ اول سطر میں لکھا ہے کہ "تمام وسائل پیداوار مملکت کی ملکیت قرار پائیں گے۔" اگر یہاں "تمام قدرتی و مصنوعی وسائل" کے الفاظ ہوں تو بات کچھ زیادہ صاف ہو جائے گی۔ قرارداد کی یہ شق روسی اشتراکیت کا کوئی خطرہ نہیں رہنے دیتی۔ لیکن یہ دیکھنا بھی ضروری ہے کہ مصنوعات پر اس کا کوئی برا اثر نہ پڑے۔

(۲) اسی صفحے کے (۹) کے آخر میں یہ الفاظ ہیں "کہ ہر فرد ملت سے یکساں فاصلے پر رہے۔" مفہوم کو بڑی خوبی سے ادا کیا ہے لیکن اس میں شک ہے کہ یہ زبان قانون کی ہے یا انشا پردازی کی۔ اگر قانونی زبان میں اس کی وضاحت ہو تو زیادہ اچھا ہو۔

(۳) اسی صفحے کے آخری الفاظ یوں ہیں "انسانوں کو دوسرے انسانوں کے استبداد و استیلا اور سلب و نہب سے نجات دینے کا

موجب ہیں "الفاظ ایسے ہونے چاہئیں جن میں" معاشی سیاسی اور روحانی" ہر طرح کے استیلا کی نفی ہو کہ سلطانی بھی عیاری ہے درویشی بھی عیاری۔"

(۴) اسی صفحہ کے (۶) میں "جان، مال، مذہب" کے آگے اگر "معابد" کا بھی اضافہ ہو جائے تو اور اچھا ہے۔ اگرچہ "مذہب" میں یہ چیز آجاتی ہے۔

(۵) ہاں شق کے (۱) میں جہاں جغرافیائی، نسلی، وطنی، لسانی" کے الفاظ ہیں وہاں "فرقی اور پیشائی" کا اضافہ مناسب ہے۔

طلوع اسلام محترم جعفر صاحب کے مشوروں کے ضمن میں گذارش ہے کہ۔

(۱) ہمارے مسودہ قرارداد مقاصد کی متعلقہ شق حسب ذیل ہے:

تمام وسائل پیداوار مملکت کی ملکیت قرار پائیں گے اور فطرت کی تمام قوتوں کو مسخر کر کے انہیں انسانیت کی نشوونما کے لئے کام میں لانے کا فریضہ مملکت پر عائد ہو گا۔

ظاہر ہے کہ "تمام وسائل پیداوار" میں فطرتی اور مصنوعی دونوں وسائل شامل ہیں۔ دراصل مصنوعی وسائل فطرتی پیداواری کی ایک بڑھی ہوئی شکل کا نام ہے۔ فطرت زمین سے روئی پیدا کرتی ہے اور کارخانہ اس روئی کو کپڑے میں تبدیل کر دیتا ہے۔ کپڑے پر مملکت کا مشترکہ اقتدار اسی صورت میں قائم ہو سکتا ہے جب زمین اور کارخانہ دونوں مملکت کے اقتدار میں ہوں۔ واضح رہے کہ جیسا کہ ہم دسمبر کی اشاعت میں واضح کر چکے ہیں، مملکت سے مراد امتِ اسلامیہ ہے نہ کہ افرادِ امت کا کوئی خاص طبقہ جس کے ہاتھ میں نظم و نسقِ مملکت ہو۔

(۲) ہمارے مسودہ کے الفاظ یہ ہیں:

امور مملکت کے فیصلے باہمی مشاورت کے اصول پر طے پائیں گے اور اس مقصد کے لئے ملت کی تنظیم اس انداز سے کی جائیگی کہ ہر فرد ملت کے مرکز سے یکساں فاصلے پر رہے۔

یہ آخری فقرہ ہمارے نزدیک مفہوم کو نہایت جامعیت سے ادا کرتا ہے۔ انگریزی زبان میں ایک لفظ ہے "Equidistant" یہ لفظ آئینی زبان میں بھی استعمال ہوتا ہے اور اس سے مفہوم یہی ہوتا ہے کہ ملت کے سرچشمۂ نظم و نسق کے نزدیک افراد ملت میں اضافی نسبتوں سے تفریق نہ کی جائے۔ ہمارے ہاں عام طور پر اس مفہوم کو "مساوات" یا "یکساں سلوک" کے الفاظ سے تعبیر کیا جاتا ہے لیکن یکساں سلوک سے ایک غلط فہمی کا امکان ہوتا ہے۔ یہ بات ایک مثال سے بآسانی سمجھی جا سکتی ہے۔ ایک کمرے میں بجلی کا پنکھا، ریڈیو سیٹ اور مختلف قوتوں کے قمقمے لگے ہیں جو بجلی کے پاور ہاؤس سے ایک ہی تار کے ذریعہ مربوط ہیں۔ اس تار میں برقی رو آتی ہے اور ہر چیز اپنی اپنی ضرورت اور استعداد کے مطابق اس رو کو اپنے اندر جذب کر لیتی ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ ہر شے کو بجلی کی مقدار "یکساں" نہیں ملی اس لئے بجلی کی یہ تقسیم مساویانہ (Equal) نہیں کہلا سکتی۔ لیکن یہی تقسیم صحیح اور فطری ہے۔ انگریزی میں اسے "Equitable" کہتے ہیں۔ اسلئے

"Equality" اور "Equity" میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ "Equality" نہ ممکن ہے نہ مقصودِ فطرت ہے۔ "Equity" ممکن بھی ہے اور منشائے فطرت کے مطابق بھی۔ قرآن میں عدل اور قسط کے الفاظ سے جس لطیف فرق کی طرف اشارہ کیا گیا ہے وہ اربابِ بصیرت سے پوشیدہ نہیں۔

بایں ہمہ ہمیں کسی لفظ پر اصرار نہیں ہوتا۔ اگر قانون داں طبقہ اس مفہوم کو بہتر اور واضح تر الفاظ میں ادا کرے تو وہ یقیناً انسب ہوگا۔

(۳) ہمارے الفاظ یہ ہیں:

انسانوں کو دوسرے انسانوں کے استبداد و استیلاء اور سلب و نہب سے نجات دینے کا موجب ہیں۔

اس میں سیاسی، معاشی، معاشرتی، روحانی ہر قسم کے استیلاء کی نفی ہو جاتی ہے۔ ان الفاظ کے اضافے سے "وضاحت" ضرور ہو جاتی ہے لیکن مفہوم مطلق سے مقید ہو جاتا ہے۔ اس مفہوم کو یوں بھی ادا کیا جا سکتا ہے:

انسانوں کو دوسرے انسانوں کے سیاسی، معاشی، معاشرتی، روحانی غرضیکہ ہر قسم کے استبداد و استیلاء اور سلب و نہب سے نجات دینے کا موجب ہیں۔

(۴) غیر مسلموں کے معابد کی حفاظت نصِ قرآن کی رو سے امتِ مسلمہ پر فرض ہے اسلئے اس لفظ کا اضافہ مفہوم کو اور واضح کر دیتا ہے۔

(۵) جیسا کہ اوپر عرض کیا جا چکا ہے، اسلام میں کوئی اضافی نسبت افرادِ انسانیہ میں وجہ تفریق نہیں ہو سکتی۔ اس لئے قومی، پیشائی تفریقیں بھی اسی طرح سے غیر اسلامی ہیں جس طرح جغرافیائی، نسلی تفریقیں۔ لہٰذا ان الفاظ کا اضافہ بھی مناسب ہے۔

علی اسد اللہ صاحب تحریر فرماتے ہیں:

۱۔ حاکمیت یا اقتدارِ اعلیٰ کے بارے میں ذکر اور اس کا واضح اعلان کہ کسی انسان پر انسان کا کسی قسم کا اقتدار نہ ہونا چاہئے از روئے قرآن۔

۲۔ فقرہ (۶) کی مزید وضاحت کی ضرورت ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ غیر مسلم کے لئے ملازمتوں کی روزگار کا ذریعہ بالکل بند کر دیا جائے گا۔ چھوٹے بڑے سب عہدوں سے محرومی۔

۳۔ فقرہ (۷) میں بجائے "ختم کر دی جائے گی" کے حسب ذیل الفاظ ہونے چاہئیں "کی مناسب اصلاح و ترمیم کی جائے گی"۔

طلوعِ اسلام (۱) سارا قرآن اسی ایک لفظ کی تشریح ہے کہ کسی انسان کو دوسرے انسان پر اقتدار اور حکومت کا حق حاصل نہیں۔ اسلام میں توحید سے مراد یہی ہے ورنہ نظری طور پر کسی نے ایک خدا کہہ دیا تو کیا دس کہہ دیئے تو کیا: "ارباب من دون اللہ" انہی قوتوں کا نام ہے جن کا اقتدار تسلیم کیا جاتا ہے۔ اس باب میں قرآن بہ نصِ صریح فرماتا ہے کہ ماکان لبشر ان یوتیہ اللہ الکتاب و

الحکم والنبوۃ ثم یقول للناس کونوا عبادا لی من دون اللہ۔ (۳/۷۹) کہ کسی انسان کے لئے یہ جائز نہیں کہ اگر اللہ سے قانون اور نبوت اور حکومت کے منصب پر سرفراز کرے تو وہ انسانوں سے یہ کہے کہ تم خدا سے ورے میری محکومی اختیار کرو۔

خدا کی محکومی کوئی نظری چیز نہیں ایک عملی شے ہے اور اس سے مفہوم ہے خدا کے قانون کی اطاعت۔ چنانچہ جو آیت اوپر لکھی گئی ہے اس کا اگلا حصہ یہ ہے ولکن کونوا ربانیین بما کنتم تعلمون الکتاب وبما کنتم تدرسون۔ (۳/۷۹) یعنی تم سب کو ربانی بننا ہوگا اور یہ اس ضابطہ قوانین کی اطاعت سے ہو سکے گا جسے تم پڑھتے پڑھاتے ہو اور جس کے نقوش تمہارے قلب اور دماغ پر مرتسم ہوتے ہیں۔ یعنی خدا کی محکومیت سے مراد ہے خدا کے قانون کی اطاعت۔ اسی لئے دوسری جگہ ہے کہ ومن لم یحکم بما انزل اللہ فاولئک ھم الکفرون۔ جو قوم بھی اپنی حکومت کو قوانین خداوندی کے مطابق نہیں رکھتی وہ خدا کی منکر ہے۔ ان تصریحات سے ظاہر ہے کہ اطاعت خدا کے قانون کی ہو سکتی ہے لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی سمجھ لینا چاہئے کہ یہ اطاعت انفرادی نہیں پوری امت کی اطاعت ہے، اور اس نظام اطاعت کیلئے نظم ونسق کی ضرورت ہے۔ اس نظم ونسق کی رو سے بعض افراد کے ذمے یہ فریضہ عائد ہوگا کہ وہ قوانین خداوندی کا عملی نفاذ کریں۔ اسلئے ان احکام کی اطاعت لازم ہوگی جو ان لوگوں کی طرف سے نافذ ہوں۔ ظاہر ہے کہ یہ اطاعت ان افراد کی اطاعت نہیں ہوگی بلکہ قانون خداوندی کی اطاعت ہوگی۔ اسلئے کہ وہ لوگ خود بھی تو انہیں احکام کی اطاعت کر رہے ہوں گے۔ جن لوگوں نے اطاعت رسول کو اطاعت خداوندی سے الگ ہٹا کر ایک مستقل اطاعت تصور کر لیا وہ اسی غلط فہمی میں مبتلا ہو گئے۔ رسول کے ذمے قوانین خداوندی کے نفاذ کا فریضہ عائد ہوتا تھا۔ لہٰذا قوانین خداوندی کی عملی اطاعت ان احکام کی اطاعت تھی جنہیں رسول اللہ نافذ فرماتے تھے لیکن یہ احکام رسول اللہ کے احکام نہیں تھے، اس لئے کہ رسول اللہ خود ان احکام کی اطاعت کرتے تھے۔ بلکہ اوروں سے بھی پہلے کہ انا اول المسلمین حضورؐ کا اقرار نامہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے ایک طرف جہاں اطاعت رسولؐ کا حکم دیا تو دوسری طرف یہ بھی واضح طور پر فرما دیا کہ کسی رسول کو بھی یہ حق حاصل نہیں کہ وہ لوگوں سے اپنے احکام کی اطاعت کرائے۔ وہ صرف خدا کے احکام کی اطاعت کرائے۔ خدا کی اطاعت کا یہی وہ عملی نظام ہے جو قرآن کا مقصود ہے اور جسے رسول اللہ کے بعد حضورؐ کے جانشین یعنی ملت اسلامیہ کا ہر دور کا مرکز بدستور قائم رکھتا چلا جائیگا۔

۲) ہمارے مسودے کا پہلا فقرہ یہ ہے کہ دستور پاکستان کی رو سے تمام افراد کی ضروریات زندگی فراہم کرنے کی ذمہ داری مملکت پر ہوگی۔ اس سے ظاہر ہے کہ غیر مسلموں کیلئے رزق کے دروازے اسی طرح سے کھلے ہونگے جیسے مسلمانوں کے لئے۔ البتہ جو لوگ قرآنی آئیڈیالوجی پر ایمان نہیں رکھیں گے انہیں نظام مملکت میں شریک راز اور شریک حکم نہیں کیا جا سکے گا۔ اس کے یہ معنی بھی نہیں ہیں کہ ان پر ہر ملازمت کے دروازے بند ہوں گے۔

۳) فقرہ نمبر ۷ حسب ذیل ہے:

ساری مملکت ایک وحدت ہوگی اور موجودہ صوبجاتی تقسیم جو ملت کے تشتت اور انتشار کا باعث ہے ختم کر دی جائیگی۔

قرآن کی رو سے ہر وہ روش جو ملت میں تشتت و انتشار کا موجب ہو مٹا دینے کے قابل ہے۔ غالباً محترم مستفسر کا ذہن اس طرف منتقل ہوا ہے کہ مملکت کے نظم و نسق کے لئے ملک کو مختلف حصوں میں تقسیم کرنا ضروری ہوگا۔ اس سے ہمیں اتفاق ہے لیکن انتظامی امور کے مملکت میں مختلف دائرے قائم کرنا اور چیز ہے اور موجودہ صوبجاتی تقسیم کہ جس نے قومیت کی تقسیم کی شکل اختیار کر لی ہے اور چیز ہے۔ صوبجاتی تقسیم فوراً مٹانا چاہئے اور پورے ملک کو ایک وحدت تسلیم کر کے انتظامی دوائر میں تقسیم کر دینا چاہئے۔ تفصیل ان امور کی اس آئین کے خاکے میں ملے گی جو طلوع اسلام کی طرف سے مجلس دستور ساز کے پاس بھیجا جائے گا اور جو توفیق ایزدی آئندہ پرچے میں آپ کے ملاحظہ سے گزرے گا۔

ایک اور صاحب لکھتے ہیں کہ جب ہم یہ کہتے ہیں کہ ہر شے پر ملکیت خدا کی ہے اور لوگ صرف امین ہیں مالک نہیں ہیں تو پھر زمین وغیرہ اگر اسی طرح لوگوں کے پاس رہے جس طرح آج ہے تو اس پر کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ وہ تو امین ہیں، مالک نہیں۔

طلوع اسلام جس طرح فریب نفس انسانی اعمال کو خوشنما بنا کر دکھاتا ہے اسی طرح وہ لفظی آرائشوں سے بھی بہت سے التباس پیدا کرتا ہے۔ اسی قسم کے التباس کی مثال وہ ہے جو اس خط میں پیش کی گئی۔ اصل سوال یہ ہے کہ مالک اگر خدا ہے تو امین کون ہے۔ اسے ایک مثال سے سمجھئے۔ کسی رئیس کے بہت سے مکانات ہیں جو اس نے کرائے پر دے رکھے ہیں۔ اس کا ایک کارندہ ہے جو ہر ماہ لوگوں سے کرایہ وصول کرتا ہے۔ یہ کارندہ امین ہے یعنی وہ لوگوں سے کرایہ وصول کرتا ہے اور وصول شدہ رقم کو بطور امانت اپنے پاس رکھتا ہے اور اس کے بعد مالک کے سپرد کر دیتا ہے۔ مالک اسے بطور حق الخدمت کچھ معاوضہ دیدیتا ہے جو اس کی تنخواہ کہلاتی ہے۔

اب دوسری طرف آیئے۔ ایک بہت بڑا زمیندار ہے جس نے اپنی زمین کاشتکاروں کو بٹائی یا لگان پر دے رکھی ہے۔ یہ زمیندار ہر سال کاشتکاروں سے پیداوار کا حصہ یا زرِ لگان وصول کرتا ہے۔ اگر زمیندار امین ہے اور مالک خدا ہے تو اسے یہ تمام پیداوار یا زرِ لگان خدا کے خزانے میں جمع کرنا چاہئے اور وہاں سے اپنا حق الخدمت بطور تنخواہ لینا چاہئے۔

کیا آپ نے کسی زمیندار کو یہ کچھ کرتے دیکھا ہے کہ اس نے جو کچھ کاشتکاروں سے وصول کیا ہو اسے جا کر خدا کے سپرد کر دیتا ہو۔ وہ سب کچھ اپنے پاس رکھتا ہے۔ زیادہ سے زیادہ خدا کو اڑھائی فی صدی خیرات دے دیتا ہے۔ فرمایئے کہ اگر وہ اپنی یہی حیثیت رکھے لیکن کہے کہ ان زمینوں کا مالک تو خدا ہے اور میں صرف امین ہوں، تو اس سے بڑا دھوکہ اور کیا ہو سکتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ جب دین مذہب سے بدل جاتا ہے تو قوم تجریدی گفتگو (Abstract talk) میں مشغول ہو جاتی ہے۔ "ہر چیز کا مالک خدا ہے"، "یہ سب کچھ خدا ہی کا ہے"، "ہمارا اس میں کیا ہے"، "اسی کا مال ہے"، "وہ شہنشاہِ حقیقی ہے"، "بادشاہت اسی کی ہے" وغیرہ وغیرہ قسم کے نعرے وردِ زبان رہتے ہیں اور کبھی کوئی اس پر غور کرنے کی ضرورت نہیں سمجھتا کہ ہماری عملی زندگی میں ان چیزوں کا مفہوم کیا ہے۔ قرآن نے خدا کا جو تصور دیا تھا اس کا تعلق ہماری عملی زندگی کے ایک ایک سانس کے ساتھ وابستہ تھا۔ صفاتِ خداوندی جنہیں

اسماء الحسنیٰ سے تعبیر کیا گیا ہے ان اقدار کا نام ہیں جس سے ایک مومن کی عملی زندگی کا قالب (Pattern) تیار ہوتا ہے لیکن مذہب کی دنیا میں یہی اسمائے حسنیٰ یا الٰہیات کی نظری بحثوں کا موضوع بن جاتے ہیں یا زعفران سے چینی کے پیالے میں لکھ کر چاٹنے کا مسالہ۔

خدا کی مالکیت کا عملی مفہوم یہ ہے کہ ان اشیاء میں کوئی انسان یا انسانوں کی جماعت اپنے بنائے ہوئے اصولوں کے مطابق تصرف نہیں کر سکتی۔ خدا نے اپنی ملکیت کی چیزیں انسانوں کو استعمال کیلئے دی ہیں اور ان کے استعمال کیلئے کچھ اصول متعین کر دیئے ہیں۔ ان اصولوں کے مطابق ان اشیاء کا استعمال کرنے والا امین بنتا ہے۔ یہ امانت نوعِ انسانی کی مشترکہ امانت ہے۔ اس امانت کے استعمال کا پہلا اصول یہ ہے کہ یہ "سواءً للسائلین" رہے۔ یعنی یہ ہر شخص کی ضرورت پورا کرنے کا ذریعہ بنے اور اس طرح خدا کی رب العالمینی (تمام نوعِ انسانی کی فطری صلاحیتوں کی بروئندی) کی صفت کا عملی مظاہرہ ہو۔ ملتِ اسلامیہ خدا کی ملکیت کی امین ہے اور اس کی ذمہ دار کہ وہ اس امانت کو اس کے متعین کئے ہوئے اصولوں کے مطابق نوعِ انسانی کے فائدے کیلئے صرف میں لانے کا انتظام کرے۔ یہ ہے عملی نقشہ خدا کے مالک اور انسانوں کے امین ہونے کا۔ نہ یہ کہ چند افراد خدا کی املاک کے گرد سانپ کی طرح گھیرا ڈال کر بیٹھ جائیں اور کہتے یہ رہیں کہ ہم تو صرف امین ہیں مالک نہیں۔ مالک حقیقی خدا ہے۔

IV ایک اور صاحب لکھتے ہیں کہ اگر وسائل پیداوار مملکت کے سپرد کر دیئے جائیں تو افراد کی آزادی سلب ہو جاتی ہے اور ان کیلئے کوئی جذبہ محرکہ (Incentive) نہیں رہتا جس کی رو سے وہ زیادہ سے زیادہ محنت کریں۔

طلوعِ اسلام پہلے جذبۂ محرکہ کے سوال کو لیجئے۔ آج ہمارے لئے یہ سوال تو یونہی سا نظر آتا ہے کہ وسائل پیداوار امت کی مشترکہ ملکیت ہوں یا افراد کی جداگانہ ملکیت۔ لیکن ان چیزوں کو تو ہر مسلمان متفقہ طور پر مانتا ہے کہ اسلام میں:

۱) نہ اکتناز جائز ہے نہ احتکار۔ یعنی کوئی شخص نہ دولت کو جمع کر کے رکھ سکتا ہے اور نہ اجناس کا ذخیرہ رکھ سکتا ہے۔

۲) وہ اپنی ضروریاتِ زندگی میں نہ اسراف کر سکتا ہے نہ تبذیر یعنی وہ نہ بلا ضرورت کچھ صرف کر سکتا ہے اور نہ ضرورت سے زیادہ۔

اب ایک ایسے زمیندار کو لیجئے جس کے پاس دس ہزار ایکڑ زمین ہے یا ایسے کارخانہ دار کو لیجئے جس کی بڑی بڑی فیکٹریاں چل رہی ہیں انہیں سال کے بعد دو لاکھ روپیہ وصول ہو جاتا ہے۔ اب سوچئے کہ وہ اسلام کے مذکورہ صدر احکام کی روشنی میں اس روپے یا غلے کے اتنے بڑے انبار کو کیا کر سکتا ہے۔ وہ نہ روپے کو جمع رکھ سکتا ہے نہ غلے کو روک سکتا ہے۔ غلہ فروخت کرنے سے روپیہ ملے گا اور روپیہ جمع نہیں کیا جا سکتا۔ نہ ہی روپے کو اپنی ضرورت سے زیادہ صرف کیا جا سکتا ہے۔ فرمائیے کہ ان لاکھوں روپوں کو وہ کیا کرے۔ آپ کہہ دیں گے کہ خیرات کرے۔ اب ظاہر ہے کہ جب اسے یہ معلوم ہو گا کہ اسے اپنی ذات پر سال بھر میں صرف دو ہزار روپیہ صرف کرنے کا حق حاصل ہے اور اسے باقی روپیہ بہر حال دوسروں کو دے دینا ہو گا تو فرمائیے کہ وہ کونسا جذبۂ محرکہ ہے جس کے

ماتحت وہ اتنی محنت کرے کہ اسے سال میں دو لاکھ روپیہ حاصل ہو جائے۔ کیا وہ اس بات کو ترجیح نہیں دیگا کہ اسے سال بھر میں دو ہزار روپیہ مل جانا چاہئے، اس سے زائد وسائل پیداوار کی اسے ضرورت ہی نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ بات اسلامی نظام کی رو سے وسائل پیداوار ملت کی مشترکہ ملکیت ہوتے ہیں، اس طرز زندگی کا لازمی اور فطرتی نتیجہ ہے جو اسلام نے انسانوں کے لئے متعین کیا ہے۔ یعنی نہ روپیہ جمع کیا جا سکتا ہے، نہ ضرورت سے زیادہ صرف کیا جا سکتا ہے۔ ہم تو یہ کہتے ہیں کہ آپ اس سوال کو سردست الگ رہنے دیجئے کہ بڑے بڑے زمینداروں اور کارخانہ داروں کے پاس ان کی زمینیں یا کارخانے رہنے چاہئیں یا نہیں، آپ قرآن کے ان احکام کو نافذ کر دیجئے اور ان پر سختی سے پابندی کیجئے کہ کوئی شخص نہ روپیہ جمع کر سکتا ہے، نہ غلہ، اور اتنی رقم سے زیادہ اپنے اور اپنے متعلقین پر صرف نہیں کر سکتا۔ اس کے بعد دیکھئے کہ یہ لوگ کس طرح خود منتیں کرتے پھرتے ہیں کہ زائد از ضرورت زمینیں اور کارخانے ان سے واپس لے لئے جائیں۔ زائد از ضرورت وسائل پیداوار پر ذاتی ملکیت کی گنجائش ہی تو اس صورت میں رہتی ہے جب لوگوں کو روپیہ جمع کرنے، جائدادیں خرید کر اس روپے میں اضافہ کرتے رہنے اور اپنے آپ پر جس طرح جی چاہے صرف کرتے رہنے کی کھلی چھٹی ہو۔ اسلامی نظام کبھی اس قسم کی مضحکہ انگیز صورت پیدا کرنا نہیں چاہتا کہ ایک شخص سے یہ کہہ دیا جائے کہ تم دو لاکھ روپیہ سال کی آمدنی وصول کر سکتے ہو اور اس میں سے صرف دو ہزار روپیہ خرچ کرنے کے مجاز ہو، باقی روپیہ کو جمع بھی نہیں رکھ سکتے۔ لیکن اس کے باوجود دو لاکھ روپے کے مالک تم ہی ہو۔

باقی رہا آزادی کا سوال تو اول تو اس کا جواب خود تصریحات بالا ہی سے مل جاتا ہے۔ جب آپ کو یہ تسلیم ہے کہ اسلام اسراف اور تبذیر کی اجازت نہیں دیتا، اور نہ اکتناز اور احتکار کی، تو افراد کی آزادی پر ان قیود کو آپ خود تسلیم کر رہے ہیں۔ آزادی "قوانین کے تابع" زندگی بسر کرنے کا نام ہے۔ انسانی اختیار ان دائروں کے اندر ہی استعمال کیا جا سکتا ہے جو آئین نے متعین کر دیئے ہیں۔ قرآن انسانی زندگی پر کم از کم قیود عائد کرتا ہے، اور ان دوائر کے اندر زیادہ سے زیادہ آزادی دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے ہاں سوائے چند امور کے اوامر و نواہی (Do's and don'ts) کی کوئی لمبی چوڑی فہرستیں متعین شدہ نہیں ہیں۔

ان استفسارات سے یہ حقیقت سامنے آجاتی ہے کہ چونکہ صدیوں کی تقلیدی زندگی سے ہماری فکری قوتیں معطل ہو چکی ہیں اس لئے ہم روش عامہ سے ہٹ کر از خود غور و فکر کرنے کے اہل ہی نہیں رہے۔ یہ تقلید مذہب زدہ اور مغرب زدہ دونوں طبیعتوں کے ہاں یکساں ہے۔ مذہب پرست طبقہ کے نزدیک اسلام وہی ہے جو انھیں ماں باپ سے وراثت میں ملا ہے، اور مغرب زدہ طبقہ کے نزدیک زندگی کی صحیح روشیں وہی ہیں جنھیں انگریز اپنے پیچھے چھوڑ گیا ہے۔ مثلاً ریل اور بس میں کوئی فرق نہیں، دونوں کرائے کی سواریاں ہیں۔ انگریز نے اپنے دورِ حکومت میں ریل کو مملکت کی ملکیت قرار دیدیا لیکن بسوں کو افراد کی تحویل میں

رہنے دیا۔ اب اگر کسی وقت یہ سوال اٹھتا ہے کہ بسوں کو بھی مملکت کی تحویل میں دیدیا جائے یعنی Nationalise کردیا جائے تو ایک شور بپا ہو جاتا ہے۔ اسی طرح اگر کوئی یہ سوال اٹھائے کہ ریل بھی جہازوں کی طرح پرائیویٹ کمپنیوں کی تحویل میں دے دینی چاہئے تو یقیناً اس کی بھی مخالفت ہوگی، محض اس لئے کہ انگریزوں نے جو روش اپنے پیچھے چھوڑی ہے اس کی رو سے ریل اور ریل سازی کے تمام کارخانے Nationalised ہیں، بحری اور ہوائی جہاز اور سڑکوں پر چلنے والی بسیں پرائیویٹ مالکوں کی تحویل میں۔

ہم مسلمان ہیں اور مسلمان انسانوں کی تقلید نہیں کیا کرتا۔ اس لئے ہمیں نہ تو یہ دیکھنا چاہئے کہ انگریز کیا کرتا ہے اور نہ یہ کہ روس میں کیا ہو رہا ہے، نہ ہی یہ دیکھنا چاہئے کہ انسانوں کا پیدا کردہ جو نظام ہمارے ہاں آجکل رائج ہے وہ کیا کہتا ہے اور نہ یہ کہ مغرب کی مادہ پرستی کیا سکھاتی ہے۔ ہمیں صرف یہ دیکھنا چاہئے کہ اللہ کا دیا ہوا قانون کون سے اصولِ زندگی متعین کرتا ہے اور ان اصولوں کی روشنی میں ہم اپنے دور کے تقاضوں کے مطابق کس قسم کا عملی نظام اختیار کر سکتے ہیں۔ ہمارے نزدیک ایک مسلمان کے لئے اس کے علاوہ کوئی اور شعارِ زندگی قابلِ قبول نہیں ہو سکتا۔

سنہ ۱۹۵۱ء کا چندہ

طلوع اسلام کا چندہ گذشتہ سال دس روپے کی بجائے چھ روپے کر دیا گیا تھا۔ اس فیصلہ کی بروقت اطلاع نہ ہونے کی وجہ سے بعض احباب نے سابقہ شرح کے مطابق دس روپے چندہ ارسال کر دیا تھا۔ چنانچہ جن حضرات نے گذشتہ سال دس روپے ارسال کئے تھے ان کے بقیہ چار روپے سال رواں کے حساب میں شمار کر لئے گئے ہیں۔ وہ اگر مزید دو روپے ارسال فرما دیں تو ان کا سال بھر کا چندہ پورا ہو جائے گا۔

جن حضرات نے صرف چھ روپے ارسال کئے تھے ان کا چندہ دسمبر کے پرچہ کے ساتھ ختم ہو گیا ہے۔ جنوری کا پرچہ ان کی خدمت میں روانہ کر دیا گیا ہے۔ لیکن فروری کا پرچہ ان کی خدمت میں اسی صورت میں روانہ کیا جائے گا کہ وہ اس ماہ کے دوران میں اپنا چندہ ارسال فرما دیں۔

لہٰذا اگر آپ چاہتے ہیں کہ طلوع اسلام آپ کو باقاعدگی سے پہنچتا رہے تو سال رواں کا چندہ اولیں فرصت میں روانہ کر دیجئے۔

ناظم ادارۂ طلوع اسلام

باب المراسلات

ریڈیو اور درسِ قرآن

ایک صاحب کراچی سے تحریر فرماتے ہیں:

دسمبر کے طلوعِ اسلام میں آپ نے ضمناً اس درسِ قرآن کی ایک مثال لکھی ہے جو ایک عرصہ سے کراچی ریڈیو اسٹیشن سے صبح کے وقت نشر ہوتی ہے۔ مجھے حیرت ہے کہ آپ کو اس باب میں صرف ایک مثال ہی کیوں ملی۔ وہ درس تو شروع سے اخیر تک اسی قسم کے قصوں، کہانیوں، داستانوں پر مشتمل ہوتا ہے، اور اگر کہیں کہانیوں سے آگے بڑھ کر "حقائق" بیان ہوتے ہیں تو اس قسم کے کہ اللہ تعالیٰ نے حروفِ مقطعات یعنی الف، لام، میم وغیرہ رسول اللہؐ کو اس طرح پڑھائے جس طرح ایک مدرسی بچے کو الف، بے، تے پڑھاتا ہے۔ اس درس میں بالخصوص اللہ تعالیٰ کے متعلق جس قسم کا تصور پیش کیا جاتا ہے، اسے سن کر نگاہیں زمین میں گڑھ جاتی ہیں کہ غیر مسلم قرآن کے پیش کردہ خدا کے متعلق کیا کہتے ہوں گے۔ یہ تصور ایک مستبد، قاہر اور جابر، مطلق العنان بادشاہ کا تصور ہوتا ہے جسے نہ کسی قاعدے اور قانون کی پرواہ ہے، نہ اصول اور آئین کا خیال۔ وہ ذرا ذرا سی بات پر ناراض ہو جاتا ہے اور انتہائی غیض و غضب میں اس بندے کو عذاب دینے والے فرشتوں کے حوالے کر دیتا ہے کہ اسے جہنم میں دھکیل دیں۔ لیکن تھوڑی سی خوشامد اور تعریف سے خوش بھی ایسا ہو جاتا ہے کہ بڑے سے بڑا جرم معاف کر دیتا ہے اور انسان کو سیدھا جنت میں بھیج دیتا ہے۔ انسان اس دنیا میں ایک مجبورِ محض ہے کہ جسے کسی بات پر کوئی اختیار نہیں۔ لیکن اس کے باوجود اسے ہر عمل کا ذمہ دار ٹھہرایا جاتا ہے۔ وہ خدا کے حکم کے بغیر کوئی حرکت نہیں کر سکتا اور جب وہ کوئی حرکت کرتا ہے تو اس سے پوچھا جاتا ہے کہ تم نے یہ حرکت کیوں کی۔ پھر اس درس کی رو سے اس دنیا کو ذلیل اور قابلِ نفرت ٹھہرایا جاتا ہے۔ محتاجی اور افلاس کو خدا کے مقرب بندوں کی علامتیں قرار دیا جاتا ہے۔ یہ اور اسی قسم کی اور تعلیم ہے جو اس درس کی رو سے روزانہ نشر کی جاتی ہے اور اس کا نام رکھا جاتا ہے "درسِ قرآن"۔ خدا کے لئے کوشش کیجئے، یا تو ریڈیو سے قرآن کی صحیح تعلیم نشر ہو، اور اگر اس میں کوئی ایسی ہی دشواریاں ہیں تو کم از کم یہ سلسلہ تو بند کر دیا جائے تاکہ دنیا ہم پر ہنسنے نہیں اور ہمارے بچے اس قسم کے غلط تصورات کو اپنے ذہن میں رکھ کر نہ بڑے ہوں۔

طلوعِ اسلام

ہم نے یہ خط استفسارات کے نمونے کے طور پر شائع کیا ہے جو ریڈیو پاکستان کے درسِ قرآن کے سلسلہ میں ہمارے پاس اکثر موصول ہوتے رہتے ہیں۔ استفسارات کا یہ سلسلہ ایک عرصہ سے جاری ہے، لیکن ہم نے اس موضوع پر آج تک قلم نہیں اٹھایا کیونکہ ہم سمجھتے ہیں کہ اس قسم کے بوسیدہ پیرہن پر پیوند لگانے سے کبھی درست نہیں ہوا کرتے۔ یہ تمام چیزیں مرض کی علامات ہیں۔ اس کی علت کچھ اور ہے۔ مثلاً اسی سوال کو لیجئے۔ اس کے دو حصے ہیں، اول یہ کہ ریڈیو پاکستان اس قسم کی افسانوی تعلیم کو قرآن کے نام سے کیوں شائع کرتا ہے اور دوسرا

حصہ یہ کہ درس دینے والے مولوی صاحب اتنا بھی نہیں سمجھ سکتے کہ میں کون سی تعلیم قرآن کے نام سے پیش کر رہا ہوں۔ پہلے سوال کے متعلق اصولاً اتنا سمجھ لینا ضروری ہے کہ ارباب اقتدار کا مسلک دو قسم کا ہو سکتا ہے۔ ایک تو یہ کہ حکومت کی طرف سے وہ کچھ کیا جائے جس سے مملکت کے عوام مطمئن رہیں۔ اس کیلئے ضروری ہے کہ ہمیشہ عوام کے جذبات کا خیال رکھا جائے اور کوئی بات ایسی نہ کی جائے جو عوام کے عقائد یا خیالات کے خلاف ہو خواہ وہ عقائد یا خیالات کتنے ہی غلط کیوں نہ ہوں۔ دوسرا مسلک یہ ہوتا ہے کہ عوام کے غلط خیالات اور اعتقادات کی اصلاح کی جائے' ان کے سامنے صرف وہ بات پیش کی جائے جو حق ہو اور انہیں ہر اس بات سے روکا جائے جو باطل ہو' اور اس باب میں ان کے جذبات کا قطعاً کوئی خیال نہ کیا جائے، جس طرح ایک شفیق ڈاکٹر آپریشن کے وقت مریض کے چیخنے چلانے کا کوئی خیال نہیں کرتا۔ اس کی نگاہ مریض کے اصلاح حال پر ہوتی ہے اور وہ بلا تامل اپنی نوک نشتر کو زخم کی گہرائیوں تک لیجاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کے اصلاحی اور انقلابی مسلک کے لئے بڑے عزم و ثبات کی ضرورت ہے' اور بڑی جرأت اور بسالت کی احتیاج۔ اس قسم کا مسلک اختیار کرنے والے کبھی کبھی پیدا ہوتے ہیں' اور وہی قوموں کی تقدیروں کا رخ بدل سکتے ہیں۔ مسلمانوں میں غلط تعلیم اور غیر قرآنی معتقدات خون کے ذرات تک میں سرایت کر چکے ہیں اور ان کی اصلاح کیلئے بڑے تیز نشتر کی ضرورت ہے۔ یہ ہر شخص کے بس کی بات نہیں۔ اسلئے عافیت اسی میں سمجھی جاتی ہے کہ لوگوں کے خیالات اور معتقدات کے مطابق مسلک اختیار کیا جائے تاکہ وہ مطمئن رہیں کہ ہماری اسلامی حکومت کی طرف سے اسلام کی بڑی خدمت ہو رہی ہے۔ ہم اس باب میں ارباب حل و عقد میں سے کسی کو بھی مورد الزام نہیں سمجھتے۔ قوم کے فکر و نظر میں اتنا بڑا انقلاب پیدا کرنا ان کے بس کی بات نہیں' نہ ہی قوم میں کوئی ایسے افراد نظر آتے ہیں جن کے ہاتھوں اتنے بڑے انقلاب کا امکان ہو سکے۔ اس کے لئے ہماری سمجھ میں تو اس کے سوا کوئی دوسری بات نہیں آتی' جسے ہم اس سے پیشتر کئی بار دہرا چکے ہیں اور جس کے عوض اکثر گوشوں سے ہدف طعن و تشنیع بھی بن چکے ہیں' یعنی یہ کہ ہمارے نزدیک کرنے کا کام صرف یہ ہے کہ آنے والی نسلوں کی تعلیم و تربیت صحیح خطوط پر ہو جائے جس سے قوم کا پورے کا پورا طبقہ اس انقلاب کا سودا سر میں لے کر اٹھے جس سے یہ زمین بدل جائے' یہ آسمان بدل جائے' اور قوم کے خیالات پھر سے حقائق سے ہم آہنگ ہو جائیں۔ اس مقصد کو حکومت کی مدد کے بغیر بھی حاصل کیا جا سکتا ہے۔ سرسید نے سمجھا کہ قوم کی فلاح تعلیم جدید میں ہے تو اس نے اتنی عظیم القدر درس گاہ کی بنیاد رکھ دی۔ مولانا محمد قاسم نانوتوی نے سمجھا کہ مسلمانوں کی نجات مذہبی تعلیم کے حصول میں ہے تو انھوں نے حکومت کی مدد کے بغیر ایک اتنی بڑی مذہبی تعلیم گاہ کو قائم کر دکھایا۔ آپ کو ان حضرات کے نکات نگاہ سے اتفاق ہو یا اختلاف' ان کی کوششوں کے ثمرات کو آپ قوم کے حق میں تریاق سمجھیں یا زہر ہلاہل' لیکن اس سے تو آپ کسی صورت میں اختلاف نہیں کر سکتے کہ تعلیم کے معاملہ میں افراد کی کوششیں حکومت کی امداد کے بغیر بھی وہ کچھ کر دکھاتی ہیں جن کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔ اس وقت ضرورت ہے ایسی درسگاہوں کی جن میں علوم حاضرہ اور قرآن خالص کی تعلیم نہایت اعلیٰ پیمانے پر دی جائے اور بچوں کے قلب و نگاہ کو قرآنی قالب میں ڈھالا جائے۔ یاد رکھئے قوم میں ایسے معلمین کی کمی نہیں۔ کمی ہے سرسید اور نانوتوی کی۔

اب لیجئے سوال کا دوسرا حصہ کہ جو مولوی صاحب درس قرآن پر مامور ہیں' انھیں خود اس کا احساس کیوں نہیں ہوتا کہ ان کا درس

اس قدر مضحکہ انگیز ہے۔ اس میں بھی ہمارے نزدیک یہ صاحب قابل الزام نہیں۔ مولوی کسی فرد کا نام نہیں ہوتا، ایک ذہنیت کا نام ہوتا ہے۔ یہ ذہنیت ہر مولوی میں مشترک ہوتی ہے، کیونکہ یہ نتیجہ ہوتی ہے اس غلط تعلیم کا جو ان بچاروں کو ان کی درسگاہوں میں ملتی ہے۔ وہ تعلیم عقل کو معطل کر دیتی ہے اور کورانہ تقلید کو نہایت مزین بنا کر دکھاتی ہے۔ وہ یہ بتاتی ہے کہ جو کچھ کتاب میں لکھا ہوا ہو سچ ہوتا ہے اور جس قدر وہ کتاب پرانی ہو اسی قدر وہ حق زیادہ محکم ہوتا ہے۔ اس لئے آپ درس قرآن کے لئے کسی مولوی صاحب کو بھی مقرر کیجئے، نتیجہ ایک ہی نکلے گا، اسلئے کہ ان کے "علم" کا سرچشمہ تو ایک ہی ہوتا ہے۔ اسی بنا پر تو اقبال نے کہا تھا کہ

مکتب و ملا و اسرار کتاب کور ما در زاد و نور آفتاب

قرآن کی بنیادی تعلیم خدا کا تصور ہے۔ اگر صرف اتنی سی چیز قرآن کے مطابق پیش کر دی جائے تو اس سے وہ بڑے بڑے اہم مسائل حل ہو سکتے ہیں جنھوں نے آج مفکرین عالم کو طلسم پیچ و تاب بنا رکھا ہے ـــــ خدا کا صحیح تصور، یعنی وہ تصور جو قرآن پیش کرتا ہے حقیقت کلی کا تصور ہے اور دنیا کے مفکرین اسی حقیقت کی تلاش میں مارے مارے پھر رہے ہیں۔ اسی تصور سے انسان اور خدا اور انسان اور کائنات کے صحیح تعلق کی مثلث قائم ہوتی ہے اور تصور سے وہ تمام تضادات توافق میں تبدیل ہو جاتے ہیں جو انسان اور اس کے خارجی ماحول، انسان اور دوسرے انسان، اور خود ایک انسان کے سینے کے اندر پیدا ہو کر وجہ کشمکش اور باعث رزم و پیکار بن جاتے ہیں۔ ان تمام تضادات میں توافق صرف خدا کے صحیح تصور سے پیدا ہو سکتا ہے۔ خدا کا صحیح تصور انسان کی نگاہوں کا زاویہ بدل دیتا ہے۔ یہ اسے اس کے صحیح مقام سے آگاہ کر دیتا ہے۔ یہ اس کے سامنے اس کا نصب العین واضح طور پر متعین کر دیتا ہے۔ یہ اس کیلئے دلیل راہ بن جاتا ہے۔ یہ اسے اس کی منزل کا ٹھیک ٹھیک نشان بتا دیتا ہے۔ یوں کہنے کو تو ساری دنیا ایک ہی خدا کو مانتی ہے لیکن ساری دنیا کی تباہیوں کا باعث خدا کا غلط تصور ہے۔ قرآن اس بنیاد کو درست کرتا ہے اور پھر اس کے بعد انسانی زندگی کی جس قدر عمارت استوار ہوتی ہے وہ از خود درست ہوتی چلی جاتی ہے۔ اگر ریڈیو پاکستان سے صرف اللہ کا صحیح تصور پیش کر دیا جائے تو فضائے عالم اسی کے نور سے جگمگا اٹھے۔

یہ آج نہیں تو کبھی ضرور ہوگا۔ اس لئے کہ انسانیت کی نجات صرف اسی میں ہے۔ اور انسانیت کا مآل تخریب نہیں، تعمیر ہے۔

ڈان کا مشاعرہ ایک صاحب تحریر فرماتے ہیں:

ڈان کا سالانہ مشاعرہ رفتہ رفتہ قومی شعار سا بنتا جا رہا ہے۔ کیا کوئی رجل رشید ایسا نہیں جو لغویت کے اس بڑھتے ہوئے سیلاب کو روکنے کے لئے بند لگائے؟

طلوع اسلام اگر افیون کا اثر یہ ہے کہ وہ انسان کے قوائے عملیہ کو معطل کر دیتی ہے تو ہماری شاعری کسی صورت میں بھی افیون سے کم نہیں، کم کیا یہ تو اس سے بھی زیادہ مہلک زہر ہے۔ وہ صرف قوائے عملیہ کو شل کرتی ہے اور یہ ان قوی کو شل کر کے

ساتھ ساتھ جذباتِ بہیمیہ کو مشتعل بھی کرتی ہے۔ یعنی اس سے بیک وقت فالج اور سرسام ہو جاتا ہے۔ یہ شاعری ہمارے اس دور کی پیداوار ہے جس میں علم اور عمل دونوں پست ترین درجے تک پہنچ چکے تھے اور سامانِ عیش و عشرت کی فراوانی عام تھی۔ اگر کسی کی نگاہ مسلمانوں کی تاریخ پر ہے تو وہ علی وجہ البصیرت دیکھ سکتا ہے کہ یہ شاعری ہمارے کتنے سفینے ڈبو چکی ہے۔ پھر تماشا یہ ہے کہ شاعر کو عام مشاعرہ میں ایسا لائسنس مل جاتا ہے کہ وہ جو کچھ جی میں آئے کہتا چلا جائے، اس سے کوئی باز پرس ہی نہیں ہو سکتی۔ آپ نثر میں یہ لکھیے کہ میں ہر شام شراب میں بدمست ہوتا ہوں اور کسی کی بیٹی یا کسی کی بہن یا کسی کی بیوی یا کسی کی ماں میرے ہم آغوش ہوتی ہے (اس لئے کہ جسے معشوقہ کہا جاتا ہے اس کی حیثیت ان حیثیتوں میں سے کوئی تو ضرور ہوتی ہے۔) تو مہذب سوسائٹی جوتوں سے آپ کی تواضع کرے گی۔ لیکن اسی نثر کو آپ منظوم کر دیجئے تو یہی سوسائٹی آپ پر تحسین و آفرین کے پھول برسائے گی۔ طلوعِ اسلام اس عریاں مثال کے لئے قارئین کے ذوقِ سلیم سے معذرت خواہ ہے لیکن اس کے سوا بات کو واضح طور پر سمجھانے کا اور کوئی طریق نہیں۔

نوا را تلخ ترمی زن چو ذوقِ نغمہ کم یابی

آپ کسی مشاعرے میں جائیے اور شاعر صاحبان سے کہئے کہ جو کچھ آپ نے نظم میں لکھا ہے اسے نثر میں پڑھ کر سنائیے اور اس کے بعد دیکھئے کہ آپ کے جذبات کا کیا عالم ہوتا ہے۔ غور کیجئے کہ کتنا بڑا ہے یہ سحر کہ جس کی رو سے محض الفاظ کے اِدھر اُدھر رکھ دینے سے آپ کے تاثرات بدل جاتے ہیں۔ لیکن سحر فریب ہی ہوتا ہے حقیقت تو نہیں ہو سکتا۔ الفاظ کے رد و بدل سے مضمون میں تو تبدیلی نہیں آجاتی۔ لیکن اس بات کو ملاحظہ فرمائیے کہ جس ایک فقرہ کو نثر میں سننے کے لئے کوئی شریف آدمی تیار نہ ہو ان فقروں کی کتابیں ان مجمعوں میں پوری بلند آہنگی سے دہرائی جاتی ہیں جن میں قوم کا شریف ترین طبقہ (بہ شمول مرد و زن) موجود ہوتا ہے۔ ان فقروں پر ہر ایک سر دھنتا ہے، جوشِ مسرت سے تالیاں پیٹتا ہے، کیف و نشاط میں سرشار ہو کر پوری فضا کو قہقہہ بار بنا دیتا ہے اور سبحان اللہ سبحان اللہ کے نعروں سے اس داد و دہش میں خود خدا کو بھی شریک کر لیتا ہے۔ پاکستان بننے سے پہلے شعرا حضرات آٹے میں نمک کے برابر ہوتے تھے لیکن اب تو یوں نظر آتا ہے جیسے سارا آٹا وہاں رہ گیا ہو اور نمک ادھر چلا آیا ہو۔ بالخصوص ہمارا دارالخلافہ تو یکسر کانِ نمک بن چکا ہے۔ شاید ہی کوئی رات ایسی گذرے جس میں کہیں بزمِ مشاعرہ منعقد نہ ہو رہی ہو۔ یہ اجتماعات قومی "عمرہ" کی حیثیت رکھتے ہیں، تقریبِ "حج" کی سعادت معاصرِ ڈان کے حصہ میں آئی ہے۔ جس طرح اطراف و اکناف کے عازمین بیت اللہ شریف دو تین مہینے پہلے سفر کی تیاری شروع کر دیتے ہیں اسی طرح اس سالانہ مشاعرہ کی تیاریاں بھی دو تین ماہ قبل سے شروع ہو جاتی ہیں۔ آدھے صفحے کے اشتہارات، چوکھٹوں میں اعلانات، فلاں صاحب نے شمولیت کا وعدہ فرما لیا ہے، فلاں کا تار آ گیا، فلاں کی چٹھی مل گئی، فلاں جہاز راں کمپنی نے اتنی نشستیں "فی سبیل اللہ" خیرات کر دیں، فلاں فلاں صاحب اڑ کر ہندوستان پہنچ رہے ہیں تاکہ شعراء حضرات کو اپنے کندھوں پر اٹھا کر لائیں، یہ ٹکٹ ہو گا، وہ جگہ ہو گی، وغیرہ وغیرہ۔ اقبالؒ نے آج سے قریب چالیس سال پہلے، پہلے پہل اہلِ یورپ کو دیکھنے کے بعد مدیر مخزن کو لکھا تھا:

جو کچھ کام کر رہی ہیں قومیں انھیں مذاقِ سخن نہیں ہے۔

دنیا کی تاریخ اور انسانی زندگی کے مشاہدات اس حقیقت کی حرفاً حرفاً تائید کر رہے ہیں کہ سخن سنجی اور سخن پروری بے کار لوگوں کا مشغلہ ہے۔ ویسے تو کسی دور میں بھی بے کار قوم کبھی پنپ نہیں سکی لیکن اس دور میں کشمکشِ روزگار اسقدر شدید ہو چکی ہے کہ بے کاری تو ایک طرف اگر کوئی راہرو پاؤں سے کانٹا نکالنے کیلئے بھی رک جائے تو چلنے والوں کا ریلا اسے کچل کر رکھ دیتا ہے۔ سوچئے کہ ان حالات میں وہ قوم کس طرح سے پنپ سکتی ہے جس کے اتنے بڑے طبقہ کا مشغلہ (بلکہ یوں کہئے کہ پیشہ) "باتیں بنانا" ہو اور قوم کا باقی حصہ ان باتوں پر "واہ واہ" میں سر دھنتا رہے۔

ہمیں تسلیم ہے کہ انسانی زندگی میں تفریح کا گوشہ بھی نہایت ضروری ہے لیکن اسے نہ بھولئے کہ تفریح اسی کو زیب دیتی ہے جو کام کرنے سے تھک گیا ہو۔ جو قوم کام کی بجائے محض تفریح ہی میں مشغول رہے وہ خود زمانے کے لئے تفریح کا سامان بن جایا کرتی ہے۔ پھر یہ بھی سوچئے کہ ہمارے ہاں شاعری کو تفریح کا سامان نہیں سمجھا جاتا۔ کسی شاعر سے پوچھئے وہ اپنی شاعری کے متعلق یہ سمجھے بیٹھا ہوگا کہ زمین اور آسمان اسی کے آسرے پر قائم ہیں۔ وہ اسے فطرت کے رازِ مستور قرار دے گا اور انسانیت کے تمام مصائب کا حل اسی کو ٹھہرائیگا۔ شروع شروع میں تو وہ اس قسم کی باتیں محض تکلفاً کرے گا لیکن کچھ عرصہ کے بعد وہ ایسے فریبِ نفس میں مبتلا ہو جائے گا کہ وہ ہجر و وصل کی ان فرضی کہانیوں کو سچ مچ حقائق ماورائے کائنات سمجھنے لگ جائے گا۔ اگر آپ کہیں اس سے یہ کہہ دیں کہ ہم تو شاعری کو محض تفریح کا ذریعہ سمجھتے ہیں تو وہ اسے تہتک قرار دے گا، اسلئے یہ کہنا بھی غلط ہے کہ یہ مشاعرے محض تفریح کا سامان ہیں اور تفریح انسانی زندگی کے لئے ضروری ہے۔ یہ مشاعرے ہماری بیکاری کے مظاہر، ہمارے فریبِ نفس کی دلیل، ہمارے ایضاعِ مال و قوت کا موجب اور ہماری قوتِ عملیہ کے مفلوج کردینے کا ذریعہ ہیں۔ انہی نے ہمیں پہلے تباہ کیا اور یہی ہمیں اب تباہ کریں گے۔ آنے والا مورخ اس تباہی کا سہرا مواصر ڈان کے سر باندھیگا۔

پھر طرفہ تماشا یہ ہے کہ لغویات و خرافات کے اس محضرنامے کی پیشانی پر "۷۸۶" کا مقصد پورا کرنے کیلئے لکھ دیا جاتا ہے کہ اس کی آمدنی فلاں فنڈ میں دیدی جائے گی۔ چنانچہ اس مرتبہ اعلان ہوا ہے کہ آنے والے مشاعرے کی آمدنی سیلاب زدگان پنجاب کے امدادی فنڈ میں دی جائے گی۔

سطحی اخلاق (Cheap Morality) کی ایسی مثالیں کم دیکھنے میں آئیں گی۔ سمجھا یہ جاتا ہے کہ ذریعہ خواہ کوئی بھی اختیار کر لیا جائے اگر اس سے حاصل شدہ آمدنی کسی "کارِ خیر" میں صرف کر دی جائے تو اس ذریعہ کا عیب عیب نہیں رہتا ثواب بن جاتا ہے۔ معلوم نہیں اس کا نام خدا فریبی ہے یا خود فریبی۔

معراجِ انسانیت

محترم محمد اسرائیل صاحب (سرحد) تحریر فرماتے ہیں:

میں نے کئی روز سے رات کو معارف القرآن جلد چہارم کا پھر سے مطالعہ شروع کیا ہے۔ ہر رات قریباً تیس چالیس صفحات دیکھ لیتا ہوں۔ مطالعہ ختم کرنے کے بعد، جب چارپائی پر لیٹ جاتا ہوں، تو سوچتا ہوں کہ یہ ابھی چند منٹ پیشتر

(یعنی مطالعہ کرتے وقت) میں خواب دیکھ رہا تھا، یا کیا چیز تھی؟ کیونکہ جس اسلام یا اس کے اصول وقوانین کے متعلق میں ابھی قرآن کریم اور معارف القرآن پڑھ رہا تھا یہ کون سے اسلام کا ذکر تھا۔ اور کس دنیا کے مسلمانوں کی معاشرت یا تمدن یا طرز زندگی کے واقعات تھے۔ کہ نہ تو اب اس اسلام کی یہی شکل ہے اور نہ مسلمانوں کا یہی دستورِ حیات! اسلام تو خیر اگر لوگوں کے ہاتھوں سے غلط سلط ہو جائے تو کوئی بات نہیں۔ اللہ کا شکر ہے کہ قرآن کریم بلفظہ کیا باعرابہ ہمارے پاس محفوظ و مصئون ہے۔ اسے کھول کر ہم ہر وقت اسلام کا صحیح تصور کر سکتے ہیں۔ لیکن صد افسوس اس بات پر ہے کہ وہ کونسا خطۂ ارض ہے جہاں مسلمان اس کے مطابق زندگی گذار رہے ہوں۔ قریباً بیس برس سے میں، اسی فکر میں ہوں کہ کہیں مجھے یہ معلوم ہو جائے، اور میں وہاں ہجرت کر کے چلا جاؤں۔ اور نہ سہی مردوں کی گرد میں تو بیٹھا رہوں گا۔ مگر جب افغانستان، ایران، مصر، ترکی اور عرب کے حالات کا جائزہ لیتا ہوں تو دم بخود ہو کر رہ جاتا ہوں۔

اس کا جواب تو یہ ہے کہ ہمیں ہمت نہیں ہارنی چاہئے۔ اور بقول علامہ اقبال ہمیں اس آسمان و زمین کو بدل دینا چاہئے۔

لیکن محترم! اس اجمال کی تفصیل یا ایسا کرنا بھی کچھ مشکل ہی مشکل نظر آتا ہے۔ خصوصاً ہمارے پٹھان بھائیوں میں تو ایسا کرنا اس لئے دشوار ہے کہ یہاں زندگی محض "عصباتی" زندگی ہے۔ رگ اور خون کی زندگی ہے۔ جن کی زمین ہے یا جن کے پاس مال ہے، ان کی بات مانی جائے گی، وہی شریف کہلائے گا۔ اس کا اثر ہوگا۔ ناداروں پر قسما قسم ظلم ڈھائے گا، وغیرہ وغیرہ۔ اپنے ہم سائگی یا انسانی اور اسلامی برادری کا کوئی خیال تک ان کے ذہن میں نہیں آئیگا کہ ان کے بھی ہمارے اوپر حقوق ہیں، اور کیوں ہم نے ان پر عرصہ حیات تنگ کر رکھا ہے۔

کبھی میرے دماغ میں یہ خیال آجاتا ہے کہ "طلوعِ اسلام" میں یہ سوال کروں کہ قارئین طلوعِ اسلام میں سے، یا جن حضرات نے معارف القرآن سے اسلام کے متعلق جو کچھ سمجھ لیا ہے، ان میں سے کتنے ایسے حضرات ہیں جنہوں نے اس استفادہ کے بعد اپنی روزمرہ کی زندگی میں انقلاب پیدا کر لیا ہے، اور اپنے اعمال یا تعلقاتِ عامہ کو اس کے مطابق کر لیا ہے۔ پھر جب یہ تعداد معلوم ہو جائے تو پھر یہ دعوت دوں کہ آؤ سب مل کر ایک آبادی میں منتقل ہو جائیں، اور وہاں سے اسلام کی سچی آواز اٹھائیں اور اپنی زندگی اسلام کے مطابق گذاریں۔

کبھی دعائیں مانگتا ہوں کہ یا الٰہی مجھے اصلی اسلام کی زندگی انفرادی نہیں اجتماعی صورت میں دکھانا نصیب فرما۔ کیونکہ انفرادی طور پر تو اگر ہم بہت چاہیں لیکن نہیں کر سکتے۔ اس لئے کہ ہمارے نزدیک تو اسلام مذہب نہیں "دین" ہے جو چند مناسک اور رسومات کے ادا کرنے سے پورا نہیں ہوتا۔ مرحوم محمد صدیق صاحب بھی نہایت تعجب کے ساتھ یہ کہتے تھے کہ اسلام کو نہ معلوم مذہب کس نے بنایا۔ قرآن میں تو مذہب کا نام تک نہیں۔ یہ تو دین ہے جو ہماری ہر حرکت اور ہر سانس تک پر حاوی ہے۔ اس لئے منفرداً تو اسلام سے بہرہ مند ہونا ناممکن ہے اور اجتماعی طور پر ہماری حالت مخدوش ہے کہ جس کسی کو ایک نئی بات پسند آجائے اس کے درپے ہو جاتا ہے اور باقی اسلام یا اپنی کمی کو نظر انداز کر دیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے۔

معراج انسانیت" میں "احادیث" بھی ملے۔ اور یہ بہت اچھا ہوا۔ بدخواہوں کو معلوم ہو جائے گا کہ صاحب معارف القرآن کو معاذ اللہ ان احادیث سے جو واقعی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمائی ہوں کچھ خاص بغض و عناد نہیں ہے۔ صرف ان روایات پر تنقید کا خیال ہے جو قرآن پاک کی تعلیم یا حضورؐ کی پاک زندگی یا بلند مراتب کے خلاف ہوں، جس کی تصدیق معراج انسانیت نے کر لی۔

دراصل بات یہ ہے کہ انسان کی طبیعت ہی ایسی خام ہے کہ جس چیز کے ساتھ عادی ہو جائے وہی بھلی معلوم ہوتی ہے۔ ہمارے ہاں زیادہ تعلق فقہ کے ساتھ تھا اور ہمارا سارا اسلام فقہی تھا۔ قرآن تو کیا احادیث یا روایات سے بھی ہمارے علماء بے خبر تھے۔ چنانچہ پہلے پہل جب سر عبدالقیوم مرحوم کے دادا صاحب، یا اسی درجے کے ایک اور صاحب تھے، جب انھوں نے مصر میں احادیث اور قرآن کریم کا مطالعہ کیا اور وطن کو لوٹ آئے، تو آتے ہی وہابی بنا لئے گئے۔ کئی بار ان پر پتھراؤ کیا گیا۔ اور آخر کار اول الذکر کے بیٹے (سر عبدالقیوم) کے والد کو اسی جرم میں قتل کیا گیا۔ اور دوسرے صاحب کو آخری عمر تک اتنا تنگ کیا کہ خدا کی پناہ۔ ہندوستان بہرحال یہاں سے بہتر تھا۔ یہاں محدثین کی جماعت کافی مدت سے چلی آرہی تھی اور قرآن کریم سے شغف بھی رکھتے تھے۔ لیکن پھر بھی قرآن کی طرف کما حقہ توجہ نہ تھی۔ مدارس عربیہ میں تمام علوم پڑھائے جاتے تھے ماسوا قرآن کے۔ قرآن سوا پارہ درس میں شامل تھا اور بس! ان حالات اور ایسے ماحول میں جب لوگوں کو قرآن کی طرف بلایا جائے تو یقیناً انھیں یہ بات ناگوار معلوم ہوگی۔ مگر انشاء اللہ تعالیٰ ایک وقت ایسا آئے گا کہ سب کے سب سمجھ جائیں گے۔ شکر ہے کہ اگلے علماء نے خود ہی روایات میں موضوعات کے لئے چھان بین کی ہے۔ ہدایہ، جلالین، بیضاوی، احیاء العلوم تو ان خرافات سے بھرے پڑے ہیں اور اس سے کوئی انکار بھی نہیں کر سکتا، کیونکہ خود انہی علماء نے ان کتابوں کے موضوعات پر قلم اٹھائی ہے۔

دستور پاکستان سے متعلق سفارشات

مجلس دستور ساز نے سابقہ اجلاس میں بنیادی اصولوں کی کمیٹی کی رپورٹ پر بحث کو ملتوی کرتے ہوئے یہ اعلان کیا کہ قوم اس رپورٹ سے متعلق اپنے اعتراضات، ترمیمات یا متبادل سفارشات ۳۱ جنوری ۱۹۵۱ء تک اسمبلی کے پاس بھیج دے تاکہ ان پر غور و خوض کیا جا سکے۔ دسمبر کی اشاعت میں ہم نے اس فیصلہ پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا تھا کہ یہ فیصلہ نتائج حسنہ کا پیامبر ہو سکتا تھا لیکن حکومت کی شرائط ایسی ہیں کہ ہم اس سے چنداں پُر امید نہیں۔ بہر حال معلوم ہوتا ہے کہ یہ اعلان ہوتے ہی بعض حضرات نے اپنے خیالات سے مجلس دستور ساز کو آگاہ کیا۔ یہ خیالات کیا ہیں اور کس شکل میں پیش کئے گئے؟ اس کا ہمیں علم نہیں۔ البتہ انہی دنوں اخبارات میں ایسوسی ایٹڈ پریس کی طرف سے ایک خبر شائع ہوئی ہے جو سرسری جائزہ ہے ان تجاویز کا جو مجلس دستور ساز کو موصول ہوئی ہیں۔ جن حضرات نے اس خبر کو پڑھا ہے انھوں نے بادی النظر ہی میں اس استہزار کو محسوس کر لیا ہوگا جو اس کے انداز میں پایا جاتا ہے۔ خبر میں بتایا گیا ہے کہ اب تک مجلس مذکورہ کو جو "سفارشات" پہنچی ہیں وہ مہمل اور غیر متعلق ہیں۔ اسی اطلاع کے مطابق بعض حضرات نے چھپے ہوئے پمفلٹ بھیجے ہیں، بعض نے شرعی سزاؤں کا ذکر کیا ہے، وغیرہ وغیرہ، اور قابلِ ذکر مشورہ کسی نے نہیں دیا۔ خبر نگار صاحب ایسا لکھ کر بداہتاً یہ اثر پیدا کرنا چاہتے ہیں کہ گویا ساری قوم میں کوئی شخص بھی ایسا نہیں جو اس ضمن میں کوئی وقیع مشورہ دے سکے۔

یہ ظاہر ہے کہ مشورے حکومت نے طلب کئے تھے اور جو مشورے موصول ہوئے وہ بھی حکومت ہی کو موصول ہوئے۔ لیکن سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان تجاویز کی جانچ پڑتال کے لئے حکومت نے کس کو متعین کیا؟ کیا ایسوسی ایٹڈ پریس کا خبر نگار حکومت کی طرف سے مامور تھا کہ وہ ان تجاویز کا جائزہ لے اور ان کا یوں چرچا کرے؟ اگر وہ حکومت کی طرف سے متعین نہیں تھا تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ کاغذات اس کے ہاتھ کیسے لگے؟ گو بظاہر یہ خبر ایک خبر رساں ایجنسی کی ہے لیکن حکومت کی خاموشی مصلحت آمیز معلوم ہوتی ہے اور گمان ہوتا ہے کہ یہ خبر حکومت کے ایما سے شائع ہوئی ہے۔ یہ خبر حکومت کے علم کے بغیر شائع ہوئی ہے تو اور حکومت کے ایما سے شائع ہوئی ہے تو قابل افسوس ہے۔ جب حکومت نے قوم سے از خود مشورے طلب کئے ہیں تو ظاہر ہے کہ ہر شخص، جسے بھی اس سے دلچسپی ہے اور وہ اس سے متعلق کچھ رائے رکھتا ہے، مشورے دینے کا مجاز ہے۔ یہ مشورے کس حد تک قابل قبول ہو سکتے ہیں، اس کا اندازہ وہ ماہرین کریں گے جو ان سب تجاویز کی جانچ پڑتال کریں گے۔ ابھی مشوروں کی آخری تاریخ میں ایک

مہینہ باقی ہے۔ اس دوران میں بھی مشورے موصول ہوں گے۔ اس وقت حکومت کو اس قسم کا کوئی اقدام نہیں کرنا چاہئے جس سے مشورے دینے والوں کو یہ گمان ہو کہ ان کے مشورے ردی کی ٹوکری میں پھینک دیئے جائیں گے یا ایسوسی ایٹڈ پریس کے کسی خبر نگار کے ہاتھ لگ کر اخبارات کے کالموں میں رسوا ہوں گے۔ اس سے لازماً ان کی حوصلہ فرسائی ہوگی اور اغلب ہے کہ وہ بددل ہو کر سرے سے مشورے بھیجنے سے ہی اجتناب کریں۔ اگر ایسا ہوا تو اس کی ذمہ داری حکومت پر عائد ہوگی جس نے ایسی تاسف انگیز فضا پیدا کی، حکومت کو اس معاملہ میں بڑی احتیاط سے کام لینا چاہئے اور کوئی ایسا اقدام نہیں کرنا چاہئے جس سے مشورے دینے والوں یا سفارشات بھیجنے والوں کے لئے کسی قسم کے شک وشبہ کی بھی گنجائش پیدا ہو۔

حکومت کو قوم کا تعاون حاصل کر کے آئین کے اہم ترین مسئلہ کو بطریق احسن طے کر لینا چاہئے کہ اسی میں ہم سب کی بہتری ہے۔ اگر حکومت نے ان حرکات سے قوم میں بداعتمادی پیدا کر دی تو اس سے حکومت اور قوم کے درمیان اختلاف کی وہ خلیج اور وسیع ہو جائے گی جسے پاٹنے کے لئے ہم تین سال سے زور دیتے چلے آ رہے ہیں۔

لہٰذا ہم حکومت سے عرض کرتے ہیں کہ وہ موصول ہونے والی تمام سفارشات کو مقررہ تاریخ تک بالکل محفوظ رکھے اور اس کے بعد ان سب کو من وعن شائع کر دے۔ یہ صورت نہ محض اراکین مجلس دستور ساز کے لئے مفید ہوگی بلکہ جب یہ سب کچھ چھپ کر سامنے آئے گا تو قوم بھی یہ اندازہ لگا لے گی کہ حکومت کو مختلف اداروں اور افراد نے کیا مشورے دیئے اور کونسی سفارشات بھیجیں۔

جن حضرات نے مجلس دستور ساز کو اپنے مشورے بھیجے ہیں یا جو حضرات آئندہ اپنے مشورے بھیجنے کا قصد رکھتے ہیں، ہماری ان سے استدعا ہے کہ وہ بھی حکومت سے بھی مطالبہ کریں۔ نیز وہ اس امر کا بھی خیال رکھیں کہ ان کے مشورے واقعی حکومت تک پہنچ جائیں۔

زندگی کو ان کی ضرورت ہے

جالستان - نیاز فتحپوری	۵/۸/-	اسلام کا نظامِ حیات	۴/۴/-
نگارستان "	۴/-/-	حکومتِ الٰہیہ	۲/۱۴/-
حسن کی عیاریاں "	۲/-/-	تاریخ اسلام کے حیرت انگیز لمحات	۳/۱۲/-
پردہ مودودی صاحب	۲/۸/-	اسلامی نظریۂ اجماع	۲/۱۲/-
خطبات "	۳/۸/-	اسلام کا نظامِ عدالت و سیاست	۲/۱۲/-
سود "	۲/۸/-	اسلام اور سود	۳/۸/-
دارالمصنفین اعظم گڈھ		تاجدارِ دو عالم	۲/۱۲/-
		عالمگیر اسلامی تصورات	۳/۴/-
غلامانِ اسلام	۶/۸/-	مکاتیبِ امام غزالیؒ	۳/-
اشتراکیت اور نظامِ اسلام	۴/۸/-	معاشیاتِ پاکستان	۶/۸/-
لغات القرآن حصہ اول، دوم، سوم	۱۵/-/-	مقام جمال الدین افغانی	۳/۴/-
اسلام میں غلامی کی حقیقت	۴/-/-	فلسفۂ عجم	۳/۲/-
اشاعت اسلام	۷/-/-	سیر افغانستان	۲/۸/-
مسلمانوں کا نظم مملکت	۵/-/-	فلسفۂ امن	۲/۸/-
نظامِ تعلیم و تربیت حصہ اول، دوم	۱۵/-/-	نوجوانوں کی نفسیات	۳/۱۲/-
قرآن اور تصوف	۳/-/-	نوجوانوں کی جنسی مشکلات	۳/-/-
مسلمانوں کا عروج و زوال	۵/-/-	اقبال اور قرآن	۵/-/-
حضرت امام ابوحنیفہؒ کی سیاسی زندگی	۶/۱۲/-	معراجِ انسانیت	۲۰/-/-

کتاب لمیٹڈ۔ رابسن روڈ۔ کراچی

پیغام ۔ آپ کے نام

کتاب لمیٹڈ کراچی کا خاص حصہ مبلغ ایک ہزار روپے کا ہے جو چار قسطوں میں بھی ادا کیا جا سکتا ہے۔ عام حصہ کی قیمت صرف ایک سو روپیہ کردی ہے تاکہ عوام شرکت سے محروم نہ رہیں یہ رقم یکمشت ادا کی جائے گی۔ تمام حصہ داروں کو حصص کی تعداد کے لحاظ سے منافع کی رقم برابر برابر تقسیم کی جائے گی۔ علمی مشترکہ اداروں کی ہمارے محبوب ملک پاکستان کو بیحد ضرورت ہے ہم نے اس کی بنیاد رکھدی ہے آپ اپنے سرمائے سے اسکی تعمیر کریں، آپ اور آپ کی اولاد اس کے سائے میں سکھ پائیگی۔ ایک خط لکھ کر کاغذات طلب فرمائیں۔

ہماری بہترین کتاب اقبال اور قرآن ہے قیمت پانچروپے محصولڈاک معاف

مشتہر

کتاب لمیٹڈ۔ رابسن روڈ۔ کراچی

THE ISLAMIC LITERATURE

AN ILLUSTRATED MONTHLY JOURNAL IN ENGLISH

AIMED TO:

- reflect Islam's ambition to reconquer its lost field of cultural glory
- present the new interpretation of Islam that would fit in with the changed conditions of the world
- analyse the present situation,—unearthing the hidden treasures of Islam's actual past
- be a forum for the scattered sections of the Muslim world to exchange views with one another, to feel the reality of Islam's world-wide brotherhood
- carry the message of Islam to remote corners of the world

NON-POLITICAL & NON-SECTARIAN

Contributors from all over the world

SPONSORED
non-commercially by

SHAIKH MUHAMMAD ASHRAF
KASHMIRI BAZAR, LAHORE

Rs. 10 a year; 5/8 for 6 months, specimen copy against -/8 (stamps)

WRITE TO THE SPONSOR

Time commands Business
LIMTON commands Time

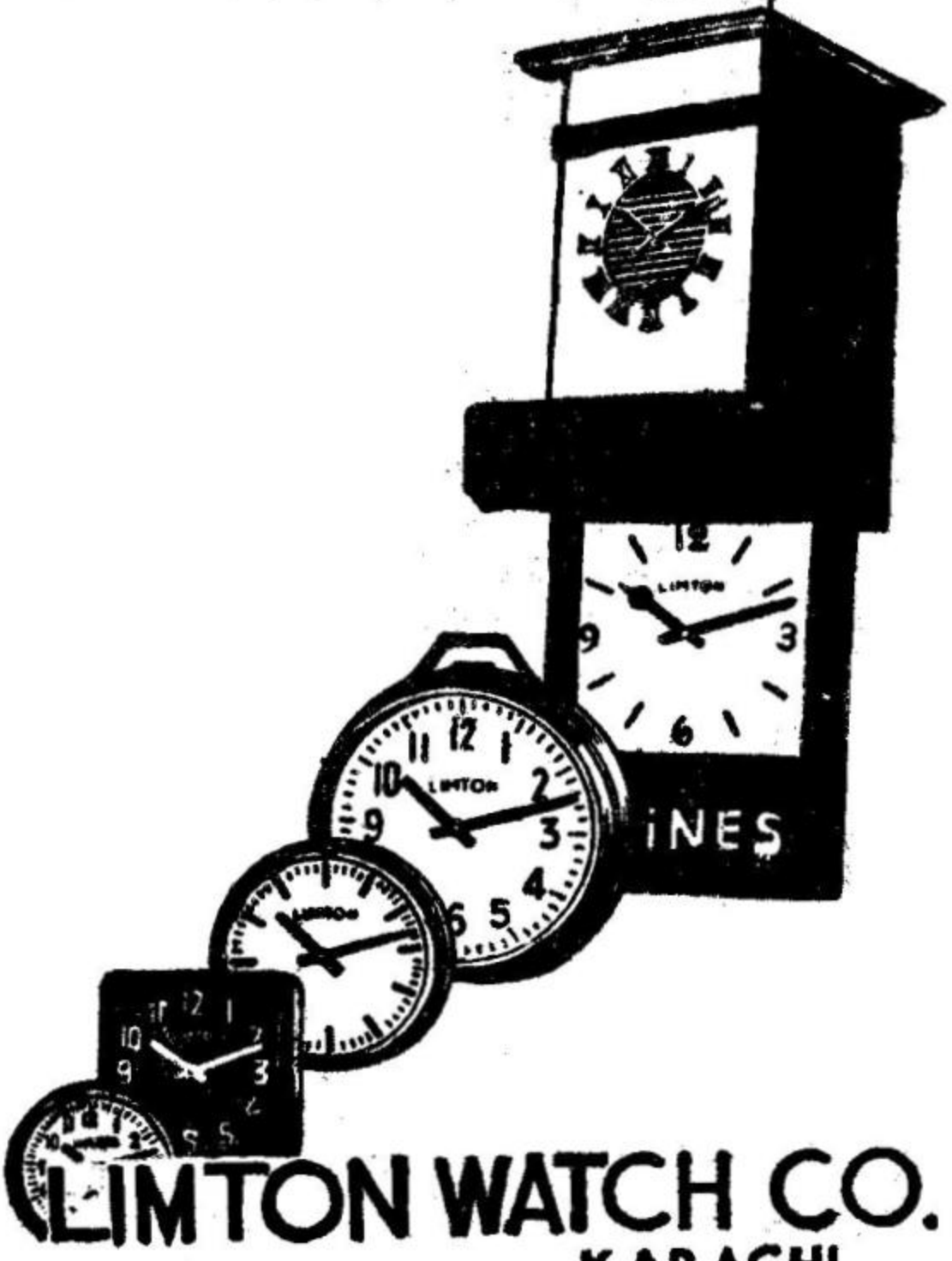

LIMTON WATCH CO.

ELPHINSTONE STREET KARACHI.